تعلیم اور ہماری قومی الجھنیں

ارشد محمود

تعلیم اور ہماری قومی الجھنیں

ارشد محمود

انتساب

اس وطن کے نام!

جس کے پاس اکیسویں صدی کے دوران بھی اپنے کروڑوں بچوں کو کتاب اور قلم

دینے کے لیے پیسے نہیں ہوں گے.....

’’مسلمان بے معنی تعصّبات اور جھوٹے احساس تفاخر میں زندہ ہیں اس کے ساتھ یہ مفلس اور پس ماندہ بھی ہیں جس کی وجہ سے ان کے مسائل دو چند ہو گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اپنی بہتری کے لیے کچھ زیادہ نہ کر پائیں گے۔‘‘

سر سید احمد خان

فہرست

دیباچہ	ڈاکٹر کنیز یوسف	7
حرف آغاز		15
تعلیم کی مختصر تاریخ		18
انگریزوں کا دور حکومت اور تعلیم		23
لارڈ میکالے۔محسن اول		28
سرسید احمد خان۔محسن اعظم		37
تاریخ اسلام میں تعلیم اور رٹے کی روایت		54
.....	کیا علم سے بیر مسلم مزاج کا حصہ ہے؟	
سائنس اور اسلامی دنیا		71
نصاب تعلیم اور دینیات		79
کیا نیکی پڑھائی جاسکتی ہے		91
ہمارا نصاب تعلیم اور مطالعہ پاکستان		97
.....	کیا حب الوطنی کے لیے متعصّب تاریخ ضروری ہے؟	
قومی سلامتی کا ضامن تعلیم یا دفاع؟		107
کچھ مباحث تعلیم		119
کیا تعلیم فارمیشن کا نام ہے؟		130
اخلاقیات اور تعلیم		137
تعلیمی مفکرین اور ہماری تعلیم		187
	سقراط۔ افلاطون۔ ارسطو۔ کوئٹیلیئن۔ کومی نیس۔	
	روسو۔ پاسٹالوزی۔ وہائٹ ہیڈ۔ جان ڈیوی	
دانش کا بحران.....(خصوصی مضمون)		195

دیباچہ

تعلیم اور ہماری قومی الجھنیں

یہ ارشد محمود کی نئی کتاب کا عنوان ہے۔ یہ کتاب متن اور اسلوب کے لحاظ سے اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے اور وہ بھی اردو میں۔ اردو میں سائنسی اور تجزیاتی اسلوب پر مبنی بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے ایسے سوال اٹھائے ہیں جن کے جواب ہمارا معاشرہ دینا نہیں چاہتا۔ اس لیے حاکم اقلیت نے ان سوالوں کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔ ہم تاریخ نہ پڑھتے ہیں نہ سمجھتے ہیں۔ تاریخی قوانین کے بارے میں ہمارا علم صفر کے برابر ہے۔ اسی لیے ابن خلدون کے بعد مسلمانوں میں کوئی دوسرا محقق تاریخ دان پیدا نہیں ہوا۔ تاریخ کا پہلا سبق جسے ہم نے پہچانا نہیں وہ یہ ہے کہ امپریلزم کا دور ختم ہو چکا ہے۔ بڑی بڑی سلطنتوں کی جگہ قومی ریاستوں نے لے لی ہے۔ دولت عثمانیہ کے اختتام پر یورپ ایشیاء اور افریقہ تینوں براعظموں میں قومی ریاستیں وجود میں آ چکی ہیں۔ یورپ میں تو کسی حد تک ایک مستحکم نظام وجود میں آ گیا مگر ایشیاء اور افریقہ ابھی سیاسی اور معاشی بدحالی کا شکار ہیں۔ اشتراکی روس کے انتشار کے بعد مشرقی یورپ میں جہاں مسلمانوں کی آبادی ایک مرکزی شکل اختیار کیے ہوئے ہے وہاں بھی امن قائم نہیں ہو سکا۔

اسی طرح برصغیر ہندو پاک میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد قومی ریاستیں تو وجود میں نہ آ سکیں لیکن ایک نیا اپریلزم قائم ہوگیا۔ یہ دور اپنے سیاسی' اقتصادی اور سماجی مزاج میں مغلیہ دور سے بہت مختلف تھا۔ سیاست میں شاہی سلطنت کی جگہ اگرچہ برطانیہ کی حکومت تھی مگر یہ حکومت قانون سازی کرتی' اسے لکھتی اور اس لکھے ہوئے قانون کے مطابق حکومت چلاتی' یہ قانون سازی انگلستان میں ہوتی اور ایک وائسرائے حکومت ہند اور حکومت برطانیہ میں بنیادی تعلق قائم رکھتا۔ اس عملداری میں برصغیر کے لوگ بھی شامل کیے گئے۔ ایک (Representative Government) کا تصور اور ڈھانچہ وجود میں آیا۔ اقتصادیات کی شکل بھی بدلی۔ تجارت' صنعت اور ان سے تعلق رکھنے والے محکمے وجود میں آئے۔ ریلوں اور نہروں کا جال بچھایا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ترقی کی مدد سے انگریز نے کروڑوں کمائے مگر اس سے بھی انکار نہیں کہ ہندوستان میں معاشی ترقی کی نئی لہر پیدا ہوئی۔ اس نظام کو چلانے کے لیے تمام تر لوگ انگلستان سے تو نہیں آ سکتے تھے لہٰذا برصغیر کے لوگوں کو نئی تعلیم دینے کا فیصلہ لارڈ کرزن کے دور میں شروع کیا گیا۔ اس ضمن میں ارشد محمود نے لارڈ کرزن کی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''رٹے کی عادت پیدا کر کے لوگ کسی طور ذہانت کے پیمانے کو عبور نہیں کر سکتے۔ یادداشت' بذات خود عقل نہیں ہے۔ وہ ذہن کی ایک صلاحیت ہے۔ مگر ہم طلباء کی یادداشت ہی تیز کیے جا رہے ہیں۔ اسی طور ان کے ذہنوں میں جیومیٹری' فزکس' الجبرا' منطق وغیرہ ٹھونس رہے ہیں پھر ان کی یادداشت کا امتحان لیتے ہیں۔ رٹے کی تعلیم پانی پر پڑی لکیر کی مانند ہے۔ ہمیں ہندوستانی تعلیم کو اس سطح سے اٹھانا چاہیے۔ اعلیٰ درجے کے اساتذہ کو لا کر ماہرانہ تعلیم کو منضبط کرنا ہوگا۔''

پھر ہندوستان میں لارڈ میکالے کی رپورٹ کے مطابق ایک جدید سیکولر نظریہ تعلیم کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کی وضاحت ارشد محمود نے نہایت عمدہ طریقے سے کی ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ میکالے نے برصغیر کے لوگوں کو ذہنی اور ثقافتی طور پر غلام بنایا ہے' مگر تاریخ شاہد ہے کہ اسی تعلیم نے سرسید' اقبال اور جناح بھی پیدا کیے۔ ہندوؤں میں تو علمی سطح مسلمانوں کے مقابلے میں

بہت بلند تھی اور سینکڑوں سکالر پیدا ہوئے اور آج بھی اسی طرز تعلیم کی تجدید نو کے بل بوتے پر بھارتی سکالرز دنیا میں نام پیدا کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کو انگریزی دور کے پہلے پچاس سال تو سمجھ ہی نہیں آئی کہ ہو کیا رہا ہے۔ مسلمان اکابرین نے انگریزی پڑھنے کے خلاف جہاد میں کئی سال برباد کر دیئے' پھر آخر سرسید نے مسلمانوں کو ان پڑھ اور غیر جمہوری معاشرے سے نکالا۔ علی گڑھ یونیورسٹی مسلمانوں کی ترقی کا اہم ترین سنگ میل ہے۔ مگر مذہبی جاہلوں نے سرسید کو کافر قرار دیا اور اس کے مقابلے میں شبلی نے جو پہلے سرسید کا ساتھی تھا' ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھ دی۔ اب مسلمانوں میں ایک علی گڑھ کے مقابلے میں دیوبندی' بریلوی اور ندوی اور کئی چھوٹے موٹے خانقاہی سکول مسلمانوں کو جاہل رکھنے میں پوری تندہی سے کام کر رہے تھے۔ انگریزی دور میں اور کوئی صنعت سامنے آئی ہو یا نہیں مگر ایک بات یقینی ہے کہ علماء کی اکثریت سرسید' اقبال اور جناح کے افکار کے خلاف کانگریس کی حامی رہی اور پاکستان بننے کے بعد انھیں لوگوں نے پاکستان کو قومی ریاست بنانے کے خلاف ایک اسلامی ریاست بنانے کا پراپیگنڈہ شروع کیا پھر آہستہ آہستہ قومی اداروں میں کھب گئے اور پھر جدید نظام تعلیم کو بہتر بنانے کی بجائے زوال کی طرف لے گئے۔ آج جو ہماری تعلیم کا حال ہے اس میں نظام اسلام کا نعرہ لگانے والوں کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ اس ضمن میں ارشد محمود نے نہایت دقیق سوال اٹھائے ہیں۔ کیا تاریخ اسلام میں رٹے کی روایت نظام تعلیم کا حصہ ہے؟ اسلامی دنیا میں سائنس ترقی کیوں نہیں کر سکی؟ کیا نیکی پڑھائی جا سکتی ہے؟ کیا نصاب تعلیم میں اس نوعیت کی دینیات جو آج کل پڑھائی جا رہی ہے مناسب ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ کیا سائنس کو مذہب کا تابع ہونا چاہیے؟ کیا حب الوطنی کے لیے تاریخ کو مسخ کرنا ضروری ہے؟ قومی سلامتی کی ضامن تعلیم ہے یا دفاع؟ اور آخری سوال ہے کہ تعلیم کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب مصنف نے کافی تحقیق کے بعد سائنسی انداز میں دیے ہیں۔

آزادی کے بعد نظام تعلیم کے سلسلے میں ہمارے پاس صرف دو سوال تھے اولاً یہ کہ تعلیم

کس زبان میں ہونی چاہیے اور تعلیم میں کیا تبدیلیاں لائی جائیں کہ نظام تعلیم اس دور کے تقاضے پورے کر سکے۔ یہ دونوں سوال تشنہ تکمیل رہے۔ جنرل ضیاء کے دور حکومت میں ہر چیز کو اسلامی بنانے کی کوشش کا آغاز بڑے شدومد سے کیا گیا۔ اس کے جراثیم معاشرے میں موجود تھے۔ ایوب کے دور میں جب پاکستان کو (Republic of Pakistan) کا نام دیا گیا تو علماء خاص طور پر مولانا مودودی نے اس میں لفظ اسلامک کو شامل کرنے پر زور دیا' لہٰذا علماء کو خوش کرنے کے لیے پاکستان کو (Islamic Republic of Pakistan) کا نام مل گیا۔ حالات سامنے ہیں' پاکستان نہ ریپبلک بن سکا نہ اسلامک۔ اس کے باوجود ضیائی دور میں تمام علوم کو اسلامی بنانے کا کام اسلامی ذہن رکھنے والے احباب نے شروع کر دیا۔ تاریخ کو مسخ کیا گیا حالانکہ سائنسی طرز فکر یہ ہے کہ آپ تاریخ کو مسخ کریں یا سچ کی تلاش کریں۔ دنیا کے واقعات تاریخی قوانین کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اگر آپ سچ کی تلاش میں رہیں تو آپ کی (Perception of events) حالات کی جانچ درست ہوگی اور فیصلے بھی درست ہوں گے۔ اگر تاریخ کی پہچان غلط ہوگئی تو حکومتی اداروں کے فیصلے بھی درست نہیں ہو سکتے۔ وقت اپنے فیصلے نہیں بدلتا' علم کی صداقت کا تقاضا ہے کہ ہر دور میں قومیں اپنی تاریخ کا تجزیہ کریں اور درست حقائق کو سامنے لا کر مستقبل کی تعمیر کریں کیوں نکہ تعلیم اور قومی ترقی کوئی الگ الگ اکائیاں نہیں ہیں۔ علم اس زبان میں پڑھا جائے گا جس میں لکھا گیا ہے۔ ایک زمانے میں لاطینی اور یونانی زبانیں مستعمل تھیں۔ پھر عربی کا دور آیا۔ آج انگریزی کا دور ہے۔ دنیا کے تمام علوم وفنون انگریزی زبان میں ملتے ہیں۔ انگریز نے ہمیں اپنی زبان یعنی انگریزی میں اس لیے تعلیم دی تھی کہ ہندوستانی زبانوں میں جدید علوم ملتے نہیں تھے اور تمام علوم کا ترجمہ تو ممکن نہیں تھا اس کے علاوہ تمام تر آبادی غیر ملکی زبان بھی نہیں پڑھ سکتی۔ انگریز نے اس بارے میں صحیح فیصلہ کیا تھا۔ انگریزی سکولوں کے ساتھ (Verneculer) سکول بھی قائم کیے تھے اور یونیورسٹی کی تعلیم انگریزی میں تھی۔ ہم اس سے بہتر فیصلہ بھی نہیں کر سکے اور نہ یہ فیصلہ کر سکے ہیں کہ اردو کس سطح

تک چلے گی۔ ایک طرف پہلی جماعت سے انگریزی پڑھائی جارہی ہے اور دوسری طرف ایم اے کے مضامین اردو میں پڑھائے جارہے ہیں اور حکومت نے کسی دفتری سطح پر اردو رائج نہیں کی لہٰذا پچاس سال گزرنے کے بعد بھی ہم اسی گومگو میں گرفتار ہیں بلکہ اس کے ساتھ علاقائی زبانوں کا مسئلہ بھی شامل ہوگیا ہے۔

دینیات کی تعلیم اور اخلاقیات پر بھی مصنف نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس باب میں دو باتیں نہایت اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ نظریہ پرستی برین واشنگ کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی ذہن رکھنے والوں کو یہ نظر کیوں نہیں آتا کہ 1977ء سے 1997ء تک کے دو عشروں میں جتنی اسلامیات اور پاکستان سٹڈیز کو پڑھایا گیا ہے۔ اخلاقیات کا اتنا ہی زوال ہوا ہے۔ شاید اخلاقی قدروں کا زوال اور جرائم کے روز افزوں پھیلتے جانے کے اسباب کچھ اور ہیں اور یہ کہ دینیات کلمے اور آئتیں رٹنے کا نام نہیں ہے مگر اسلامی ذہن رکھنے والے احباب یہ نہیں سمجھ سکتے۔ ان کی نظریاتی برین واشنگ ہوچکی ہے۔

ساتویں صدی سے دسویں عیسوی تک مسلمان علم وفنون ترقی کررہے تھے۔ انھوں نے یونانی اور لاطینی علوم کا عربی میں ترجمہ کیا اور جیسا کہ فطری تقاضا ہے ان علوم کی بدولت فلسفہ، تاریخ، طب اور سائنس میں بے بہا ترقی کی۔ اس کے بعد دو ایسے واقعات ہوئے جن کی وجہ سے مسلمانوں میں علم وفن زوال پذیر ہوا اور اس کے ساتھ مسلمان سلطنتیں بھی۔ پہلا واقع معتزلہ کا انجام تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں (Empirical Studies) اور شک کی بنا پر سوال پوچھنے بلکہ اس پر Reflect کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ فلسفہ اور ریاضی کے مضامین کی ترویج ختم ہوگئی۔ دوسرا واقع منگولوں کے حملے تھے۔ بغداد کے تاخت وتاراج ہونے کے بعد مسلمان حوصلہ ہار بیٹھے تھے۔ لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کافر منگول ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے کیسے اسلامی سلطنت کو تباہ کرنے میں کامیاب ہوگیا؟ اس سوال کا جواب مسلمان علماء نے یہ دیا کہ اس زوال کی وجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے مذہب کی پیروی سے گریز اختیار کرلیا تھا۔ نتیجہ کے

طور پر مذہبی شدت پسندی زور پکڑ گئی۔ علم میں عقل اور جدت کو خیر باد کہہ دیا گیا اور مسلمان بارھویں صدی سے بیسویں صدی تک اسی گمان میں ہے اور اسی کوشش میں ہے کہ جدید علوم وفنون کی ترقی جو تمام تر صنعتی انقلاب کے بعد یورپ میں ہوئی ہے، قرآنی آیات سے ثابت ہو سکے۔ نادان نہیں مانتے کہ اگر قرآنی آیات سے تسخیر کائنات کے عمل کو اسلامی عقیدہ حاصل بھی ہو جائے تو مسلمان علم وفن یا صنعت وحرفت میں جدید سائنسی افکار کا حامل نہیں بن سکتا۔ ارشد محمود کا امام غزالی کے حوالے سے اسلامی علوم کے حصول میں قنوطیت کی مقبولیت کا ارتقا نہایت موزوں بحث ہے۔ پاکستان کا اسلامی ذہن رکھنے والا سکالر آج بھی امام غزالی کی ''اسلام بچاؤ'' تحریک کا فعال رکن ہے۔ سیکولر لفظ سے اسے فی سبیل اللہ کا بیر ہے اور بجائے آگے بڑھنے کے جدید علوم وفنون کو اسلامی بنانے میں وقت ضائع کر رہا ہے۔ اس تگ ودو میں سائنس اور ٹیکنالوجی جس کی ترویج کے لیے پاکستان کی ہر حکومت بیان جاری کرتی رہی ہے اس پر حدود لگا رہا ہے۔ یہاں تک کہ بعض کالجوں میں اساتذہ نے فزکس کی کتابوں میں ایٹمی توانائی کے ابواب کو پڑھانا چھوڑ دیا ہے۔ بعض اساتذہ نے تو ان صفحات کو Staple کرا دیا ہے تاکہ طالبعلم خود ہی نہ پڑھ لے۔ نباتاتی سائنس یعنی Biology میں پودوں کی افزائش کے ابواب اسلامی نقطہ نظر میں غیر موزوں قرار دیے گیے ہیں۔

مصنف نے ایک وقت کا سب سے اہم سوال اٹھایا ہے۔ کیا قومی سلامتی کی ضامن تعلیم ہے یا فوج۔ سطحی طور پر دیکھا جائے تو اس کا جواب ہے فوج۔ کیونکہ فوج کی تربیت ملک کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے تیار کی جاتی ہے اور جب سے شاید سلطنت یا ریاست وجود میں آئی ہے سپاہ وقت نے محاذ آرائی سے گریز نہیں کیا۔ مگر اس ٹیکنیکی دور میں افواج کو بھی تعلیم وتربیت کی بہت ضرورت ہے۔ یہ صورت دو محاذوں پر جنگ کی تیاری کرتی ہے۔ ایک محاذ اسلحہ بنانے کا ہے اور دوسرا جنگی حکمت عملی تیار کرنے کا۔ یہ دونوں علم ودانش کے بغیر ناممکن ہیں۔ اس سرمایہ دارنہ ٹیکنیکی دور میں تو علم کی اہمیت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ ایک ریاست کی فوج صرف قومی دباؤ کے تلے

نہیں ہوتی۔اس پر بین الاقوامی دباؤ بھی ہوتے ہیں۔ان دونوں میں توازن قائم کرنے کے لیے علم و دانش بنیادی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔اس دور میں تو یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ ایک ریاست کی دفاع کے لیے خوش حالی،علم اور عسکریت لازم وملزوم ہیں۔خوش حالی سپاہ کی برتری قائم کرنے کے لیے،علم عسکری قوت کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے اور عسکریت سپاہیوں میں جذبہ حریت اور جرات قائم کرنے کے لیے۔

مصنف کا تجزیہ پاکستان کی اکثریت کو قابل قبول ہوگا کیونکہ اب جب کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک قرضوں کی قسطیں مانگنے کے لیے پاکستان پر معاشی دباؤ ڈالتے ہیں اس لیے ہر کس و ناکس سوچتا ہے کہ دفاع پر خرچ کم کیوں نہ کیا جائے۔میں اس سے متفق نہیں ہوں۔دفاع پر خرچ کرنے کے جواز میں ہمارے دفاع کا مسئلہ پیچیدہ ہو جائے گا۔حکومت کو چاہیے کہ فوج کو بھی ایک (Production Industry) بنائے دوسرا مسئلہ جو دفاع کے مسئلے سے بھی گمبھیر ہے وہ نظام تعلیم ہے۔بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں ریسرچ ہمارے کلچر کا حصہ نہیں بن سکی۔اس لیے مسلمان تخلیق کے ادراک سے دور رہ گیا ہے۔مسئلہ نظام تعلیم استوار کرنے کے لیے صرف پیسے کی ضرورت نہیں بلکہ کورسز کو ملک اور اس دور کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے از سر نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے اور اس طرف ہماری نگاہ بالکل نہیں جاتی۔

تعلیم کو زندگی کے ہر شعبے پر فوقیت دینے کے بعد ہی ہم غربت' قرضے' سود' پیداواری صلاحیت کی کمی اور مزید غربت کے چکر سے نکل سکیں گے۔اقبال نے کیا خوب کہا تھا۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

ارشد محمود کی یہ کتاب ظلمت پسندی کے خلاف جہاد ہے۔ارباب اختیار شاید اس سے کوئی فیض حاصل نہ کر سکیں کیونکہ ان کی تعلیمی پالیسیاں سکریٹریٹ کی حدود سے باہر نہیں نکلتیں۔مگر مجھے یقین ہے کہ چونکہ یہ کتاب اردو میں لکھی گئی ہے۔پاکستان کے عام لوگ اس سے ضرور

فیضیاب ہوں گے۔ جامد یا زوال پذیر حالات کو تبدیل کرنے کے دو ہی طریقے ہیں یا تو حاکم اقلیت میں کوئی مجاہد پیدا ہو جائے جو تعلیم اور معاشرے کی تبدیلی کو ریاست کی قوت کے بل بوتے پر خاطر خواہ تبدیلی لے آئے یا پھر عوام تبدیلی کے لیے اپنی سطح پر جہاد کریں اور معاشرتی ترقی کا پیش خیمہ بن جائیں۔

ارشد محمود نے یہ راستہ بھی دکھایا ہے۔ اس نے نو عالمی مفکرین کے فلسفۂ تعلیم کو مختصر مگر مکمل بیان کیا ہے۔ ان مفکرین کے حوالے سے اس نے بتایا ہے کہ جب تک ہمارے پاس ایک قومی مرکزی فلسفۂ تعلیم نہیں ہم اپنی ترقی کے نہج مقرر نہیں کر سکتے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم میں دانشمندی کا زوال اور انتشار پھیلتا ہے اور لوگوں کو اس کی سمجھ بھی نہیں ہوتی۔ جن لوگوں کو سمجھ ہوتی ہے وہ حاکم اقلیت سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ حاکم اقلیت کو ان کی تلاش بھی نہیں ہوتی۔ لہٰذا دانش کا بحران ارشد محمود کی کتاب کا (Climax) عروج ہے۔ دانشوری میں لبرل اور سیکولر سوچ کا ارتقا لازمی ہے مگر ہمارے ہاں سچ بولنا قابل تعزیر ہے۔ لبرل اور سیکولر سوچ رکھنے والوں کی تعزیر ضیاء دور میں سب سے زیادہ ہوئی۔ لہٰذا کچھ ملک چھوڑ گئے اور جو ملک نہیں چھوڑ سکتے تھے انھوں نے اپنی سوچ پر خود جمود طاری کر لیا اور دانش مر گئی۔

آخری چند سطور شعور کو جگانے کے لیے تازیانے کا کام کرتی ہیں مگر کیا کوئی اس تازیانے کو محسوس کر کے دانش کو زندہ کرنے کا اہل ہو سکے گا؟ کیا کہیں پاکستان میں فرد نہ سہی (Collective) اجتماعی دانش ابھر سکے گی؟ اس کا جواب تو وقت دے گا!!

بہر حال ارشد محمود تعلیم کے میدان کارزار میں ہماری قومی الجھنوں کو اس سچائی اور جرات مندانہ اسلوب سے بیان کرنے پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر کنیز یوسف
سابق وائس چانسلر قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد

حرف آغاز

زیرِ نظر کتاب ایک ایسے معاشرے کے المیے کو اجاگر کرنے کے لیے لکھی گئی ہے جو روشنی سے گریز کرتا ہے اور جسے اندھیرے زیادہ مرغوب ہیں۔ جہاں جہالت کو کھلی چھوٹ ہے اور علم پر ہزار پابندیاں ہیں۔ ترقی کا عمل، مادی سطح پر اس وقت تک شروع نہیں ہوسکتا جب تک اس بستی کے لوگوں میں فکری تبدیلیاں رونما نہ ہوں گی۔ اگر آج ہم اپنے قومی، سماجی اور سیاسی حالات پر مطمئن نہیں ہیں تو پھر ہمیں اپنے افکار و اقدار پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ہماری طے شدہ پالیسیاں تو درست ہوں لیکن ہم پھر بھی بھٹک رہے ہوں چنانچہ پورے قومی مزاج، فکر اور نفسیات کی مکمل جانچ پڑتال وقت کی اہم ضرورت ہے۔ آج کے سائنسی اور معاشیاتی دور میں بظاہر یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے کہ کسی قوم کو تعلیم اور ترقی سے بیر ہو لیکن بدقسمتی سے ہم اس کی زندہ مثال ہیں۔

تعلیمی شعبے پر وہ قوم خرچ کرتی ہے جسے ترقی کی سربلندی کی اور خوبصورت بننے کی امنگ ہو، لیکن یہاں صورت حال کچھ یوں ہے کہ عام شہری سے لے کر حکمران اور جاہل سے لے کر دانشور تک.....اس وطن کی چار سو پھیلی بے حساب پس ماندگی اور جہالت.....کسی کے اعصاب کو متاثر نہیں کرتی.....کسی کا سر نہیں جھکتا..... ہماری انا اور احساس تفاخر کے لیے جذباتی باتیں، کھوکھلے نعرے اور قومی نغمے ہی کافی ہیں۔ تعلیمی شعبے پر صرف یہی نہیں کہ اس پر ہم نے مطلوبہ اور کافی سرمایہ نہیں لگایا بلکہ تعلیمی فلسفہ، ماحول، نظام اور نصاب ایسے رکھے ہیں کہ ان سے

ایسے تعلیم یافتہ افراد پیدا ہوں کہ ان میں اور جاہل میں صرف کاغذی سرٹیفکیٹ کا ہی فرق ہو.....
چنانچہ ہم نے ترقی کی راہ میں بڑی بڑی فکری رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہیں' شاید کچھ ''توجہ دلاؤ''قسم کے فکری دھماکے ہمیں سوچنے' کچھ سوال کرنے پر مجبور کر دیں۔ وقت بڑی تیزی سے ہم کو پیچھے کی طرف پھینک رہا ہے۔ تہذیبی ترقی کے بڑے ہی اعلیٰ درجے پر پہنچے ہوئے دور کے سامنے ہم اپنی شناخت کے بحران کا شکار ہیں۔ ہمارا کوئی مستقبل نہیں اور نہ کوئی منزل.....ہم ماضی سے لپٹے آج میں زندہ ہیں۔ ہمارا عقل پر سے اعتبار حیران کن حد تک اٹھ چکا ہے۔ عقل سے دوری اور جذبات کے ساتھ از حد قربت نے ہماری فکری راہوں کو ایسے الجھا رکھا ہے کہ بھٹکنے کے سوا ہماری کوئی منزل باقی نہیں رہ گئی۔

پاکستان دنیا کے ناخواندہ ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے پھر بھی قوم کو اپنی یونیورسٹیوں' لائبریریوں' لیبارٹریوں' تحقیقاتی اداروں اور سکولوں' کالجوں سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی ایٹمی قوت بننے' قیمتی ترین جنگی سامان خریدنے اور کچھ لاینحل علاقائی ایشوز کو زندہ رکھنے کی خاطر بے نتیجہ قومی ہڑتالیں کرانے سے ہے' جذباتی نعروں اور فریبانہ بیانات میں نصف صدی ضائع ہو چکی ہے۔ تیسری اور چوتھی نسل حیرت سے دیکھ رہی ہے کہ ہماری سیاسی قیادت کو تعمیر وطن کے ایجنڈے کی بجائے ''آزادی کے نامکمل ایجنڈے'' سے زیادہ دلچسپی کیوں ہے؟ کروڑہا لوگوں کو خستہ حال اور ناخواندہ رکھ کر ہمیں قومی فخر کے اظہار کا کیسے حق پہنچ سکتا ہے۔ ہمیں اپنی قومی' سیاسی اور عسکری قیادت کو قائل کرنا ہوگا کہ ہم دنیا سے اتنے پیچھے رہ گئے ہیں اور مسائل اتنے گمبھیر ہو چکے ہیں کہ اب دفاع کے برابر نہیں۔ اس سے کہیں زیادہ تعلیم کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ قومی مجرم ہیں' جو اپنے بچوں کی تعلیم یورپ اور امریکہ کے تعلیمی اداروں سے دلواتے ہیں لیکن کسی بھی مالیاتی بحران میں قوم کے خفیف تعلیمی بجٹ پر سب سے پہلے ہاتھ صاف کرتے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں جن موضوعات کا چناؤ کیا گیا ہے ان کا تعلق فلسفہ تعلیم سے ہے کیونکہ ہماری تعلیم کے پیچھے بنیادی فکر سائنسی نہ ہوئی تو تعلیم کا سارا عمل غیر موثر ہو جائے گا۔ ڈگری یافتہ

جہلا کا انبوہ معاشرے کی ترقی میں کوئی بھرپور کردار ادا کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوگا۔ ہم ایک پس ماندہ قوم ہیں چنانچہ نصاب، تعلیمی ماحول اور اساتذہ کے رویے پر پس ماندہ ذہنیت کی بڑی گہری پرچھائیں پڑی ہیں۔ چنانچہ تعلیمی اداروں میں علم کم اور جہالت زیادہ ٹرانسفر کی جارہی ہے۔ ہمیں جہالت پر مبنی نظریہ حیات اور متعصّب تاریخ پڑھائی جاتی ہے جو مستقبل کی راہوں کو روشن کرنے کی بجائے حال کو مہمل اور ماضی کی اندھی سرنگوں میں پھینک دیتی ہے۔

ہمارے ہاں ان مسائل اور سوالات کو چھیڑنے کی کوشش شاید اس سے پہلے کبھی نہیں کی گئی گو ''اسلام اور سائنس'' کے حوالے سے ہمارے ایک روشن دماغ ماہر طبیعات ڈاکٹر پرویز ہود بھائی کا انگریزی زبان میں قابل تحسین کام موجود ہے لیکن میرے سامنے وسیع تر مسائل تھے جن کا احاطہ کرنا ضروری تھا بہرحال امید ہے اہل دانش ان مباحث کو مزید آگے بڑھائیں گے۔

ارشد محمود

اسلام آباد

email: arshad45@yahoo.com

تعلیم کی مختصر تاریخ

حیوانی دنیا میں بقاء اور ارتقا کے لیے اس بات کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ ایک نسل دوسری نسل کو حیات کے فن و آداب سکھائے' ان کی زندگی کا بیشتر انحصار جبلتوں اور ماحول کے رحم و کرم پر ہوتا ہے جب کہ انسان کی معاشرتی زندگی کے ارتقاء کے لیے ضروری تھا کہ پچھلی نسل اپنے تجربات اور مشاہدات کا نہ صرف اجتماعی نچوڑ اگلی نسل کو منتقل کرے بلکہ اس دنیا کو اس نے جس طرح محسوس کیا اور معاشرتی زندگی کی بقائے باہمی کو جن اقدار کی ضرورت ہے اس کے لیے آنے والی نسل کو تیار کیا جائے' علم اور اقدار کی اسی شعوری منتقلی سے تعلیم کا عمل شروع ہوا۔ حیوانوں کی طرح انسانی بچے بھی ثقافت کے بغیر پیدا ہوتے ہیں۔ پیدایش کے وقت ان کے پاس نہ علم ہوتا ہے اور نہ کسی طرح کی اقدار کے وہ حامل ہوتے ہیں۔ تعلیم کے عمل سے ان کی ثقافتی تربیت کی جاتی ہے' ان کے رویوں کو مخصوص قالب میں ڈھالا جاتا ہے اور انھیں بعد از بلوغت کے کردار کی ادائیگی کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

قدیم ترین ثقافتوں میں باقاعدہ رسمی تعلیم و تربیت نہایت محدود تھی۔ اسکول' کلاس' استاد کا کوئی تصور نہ تھا۔ سب سرگرمیاں اور سارے کا سارا ماحول ہی مدرسے اور جماعت کا درجہ رکھتا تھا جس میں سب بالغ افراد استاد کا رول ادا کر رہے ہوتے لیکن جوں جوں سوسائٹی زیادہ پیچیدہ ہوتی گئی اور علم کی مقدار کمیتی لحاظ سے اتنی بڑھ گئی کہ ایک نسل سے دوسری نسل تک ثقافتی منتقلی کے زیادہ کارگر ذرائع پیدا کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ انسان کا معاشرتی ڈھانچہ مزید

فروغ پا کر جب اور پیچیدہ ہو گیا تو علم گاہیں بھی باقاعدہ اداروں کی شکل اختیار کر گئیں لیکن قبل از تاریخ کے قدیم معاشروں میں تعلیم کی اصطلاح انتقال ثقافت (Enculturation) کے معنوں میں ہی استعمال کی جا سکتی ہے۔ قدیم و ابتدائی انسان کا اپنا ثقافتی ماحول ہی کل کائنات تھی۔ وہ وقت کو رکا ہوا اور اپنے ماحول کو ایک ابدی حقیقت تصور کرتا تھا۔ اس کے سامنے والی' دنیا ہی ساری حقیقت تھی۔ جس میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا تھا چنانچہ ثقافتی تسلسل کے بارے میں وہ ایک جامد (Fixed) نظریہ رکھتا تھا یعنی جن تجربات اور احساسات سے وہ گزرا ہے اور اس دنیا کو اس نے جس طرح پایا اور سمجھا ہے وہی حرف آخر ہے۔ اس کے آباؤ اجداد کی دنیا بھی ایسے ہی تھی اور آنے والی نسلوں کے لیے یہی اطوار و اقدار موزوں و مناسب رہیں گی۔ اسے تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے دنیا کے بدل جانے کی کوئی سمجھ نہ تھی جو ایک نسل سے دوسری نسل تک نہایت ہی معمولی انحراف کے ساتھ منتقل ہو جاتا لہٰذا اس وقت تعلیم کا مقصد قبیلے یا اپنے جتھے کے لیے اچھے ارکان بنانا تھا۔ قدیم بچے خود کام کر کے اور بڑوں کو دیکھ کر سیکھتے تھے۔ ان کے استاد اجنبی نہ تھے۔ اپنے ہی عزیز و اقارب ہوا کرتے تھے۔

مشرق وسطیٰ میں ابتدائی تہذیبیں تین ہزار سال قبل مسیح میں شروع ہوئیں۔ مصر اور میسو پوٹامیا کی تہذیبیں 1500 سے 3000 قبل مسیح میں خوب پھل پھول رہی تھیں۔ مصری ثقافت و تعلیم' مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں تھی۔ ایک چھوٹا سا پاور فل' دانش ور طبقہ (Elite) موجود تھا جو معاشرے کے سیاسی اور فکری محافظ (Bulwark) کا کردار ادا کرتا تھا چنانچہ وہ معاشرے میں کسی طرح کا ثقافتی تنوع پیدا ہونے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ مروجہ علمی مضامین' قانون' سماجیات' طب' ریاضیات اور جیومیٹری وغیرہ مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں تھے' چنانچہ وہی انھیں پڑھا اور پڑھایا کرتے تھے۔ پیشہ ورانہ ہنر جیسے عمارت سازی' انجنیئر نگ اور مجسمہ سازی کی رسمی تعلیم نہ تھی۔ سکول کے ماحول میں سخت گیری پائی جاتی تھی تا کہ انتقال کے عمل میں ثقافت کی یکسانیت قائم رہے' روایتی سوچ سے انحراف سختی سے منع تھا۔ مشق (Drill) اور حفظ (Memorization) ہی

طریقہ تدریس کے طور پر رائج تھے۔ لائبریری مندروں کے اندر ہی ہوا کرتی تھی۔ علم و دانش کی تمام سرگرمیوں پر پجاری (Priests) کا غلبہ تھا' طریقہ ہائے تدریس میں زبانی تکرار' نمونہ جات کی نقول بنانا اور انفرادی تعلیم دینے کا عام رواج تھا' تحریری ہنر کی نایابی کی وجہ سے مخطوطوں کی کاپی کرنا سب سے مشکل کام سمجھا جاتا۔ استاد اور شاگرد کے بیچ ڈسپلن نہایت شدید تھا۔

ہندوستان کی تہذیب ڈھائی ہزار سال قبل مسیح تک جاتی ہے۔ اس وقت معاشرہ سخت ترین ذات پات میں تقسیم ہو چکا تھا۔ مذہب ہندوستان میں تمام سرگرمیوں کا محور و مرکز تھا۔ وہ صرف پوجا پاٹ تک محدود نہ تھا۔ فلسفہ' قانون' اخلاقیات اور حکومتی معاملات پر بھی محیط تھا۔ ویدوں کی پڑھائی اونچی ذات والوں کے لیے ضروری تھی۔ قدیم ہندوستان میں بچہ اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر استاد کے گھر چلا جاتا' وہاں پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ استاد کی خدمت اور اس کے گھریلو کام کاج بھی کرتا۔ طالب علم کا سب سے پہلا فرض اپنے ''مدرسے'' کے مخصوص وید کو لفظ بہ لفظ زبانی یاد کرنا تھا۔ لفظوں کی درست ادائیگی پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی' وہاں قانون' منطق رسومات اور علم عروض پڑھائے جاتے اور ایسی حکایات بیان کی جاتیں جن کے ذریعے اخلاقی یا روحانی پہلوؤں کو استعارے کے پیرائے میں اجاگر کیا جاتا۔ چھٹی صدی قبل مسیح کے اختتام تک پجاریوں نے اپنے مفاد میں مذہبی رسوم اور قربانیوں کا سلسلہ اتنا شدید کر دیا کہ لوگوں میں ان کے خلاف معاندانہ جذبات اٹھ کھڑے ہوئے۔ تعلیم صرف برہمن ذات کے لوگوں تک محدود تھی' تب جین اور بدھ مت نے ویدوں کی اتھارٹی کو ماننے سے انکار کر دیا اور اسے چیلنج کیا کہ مذہبی پیشوا صرف برہمن ہی بن سکتے ہیں چنانچہ انھوں نے لوگوں کو عام زبان میں تعلیم دینی شروع کی۔ ٹیکسلا چھٹی صدی قبل مسیح میں اعلیٰ تعلیم کے مرکز کے طور پر بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ یہ علم کا ایک ایسا عظیم مرکز تھا جہاں بڑے مشہور اساتذہ اپنے اپنے اسکول چلا رہے تھے۔ چوتھی صدی سے لے کر آٹھویں صدی تک ہرشا اور گپت کا دور یونیورسٹیوں اور ہندوستانی علوم کے عروج کا زمانہ تھا۔ ٹیکسلا کی نالندہ 'Nalanda' یونیورسٹی میں ہزاروں طلباء اور اساتذہ کی تعداد

تعلیم وتدریس میں مشغول تھی۔اپنی شہرت کی وجہ سے یہاں پر بیرون ملک سے طلبا آیا کرتے تھے' داخلے کا امتحان اتنا سخت تھا کہ دس امیدواروں میں سے دو تین ہی داخلہ لینے میں کامیاب ہوتے۔ یہاں پر 1500 سے زیادہ ٹیچر ہر روز ایک سو سے اوپر مقالوں پر بحث کرتے جن کا تعلق' ویدوں' منطق' گرائمر' بدھ اور ہندو فلاسفی سے ہوتا آریہ بھٹہ Aryabhata نامی شخص بعد از گپت زمانے کا سب سے عظیم ریاضی دان تھا' طب کے علوم میں بھی یہاں پر خاصی ترقی ہوئی۔علم طب کی آٹھ سے زیادہ شاخوں کی تعلیم دی جاتی جن میں سرجری' بچوں کی بیماریوں کا علاج وغیرہ شامل تھے۔Varahaamihira گپتا زمانے کا بہت بڑا اسکالر تھا۔اسے علم نباتات سے لیکر فلکیات عسکری علوم اور سول انجنئر نگ تک سبھی میں ممتاز مقام حاصل تھا۔

ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے آنے سے پہلے تقریباً ہر گاؤں میں سکول ماسٹر ہوتا تھا۔راجوں اور امراء کے عطیات سے چلنے والے کہیں کہیں چھوٹے بڑے تعلیمی ادارے بھی تھے' لڑکیوں کی تعلیم گھر کے اندر اور پیشہ وارانہ تعلیم بذریعہ شاگردی Apprenticeship دی جاتی تھی۔ پورے اسلامی اور مغل دور میں تعلیم کی منتظم سازی میں باقاعدہ دلچسپی اکبر بادشاہ نے لی۔ اس نے بلا امتیاز عقیدہ ہندوؤں اور مسلمان کے لیے یکساں اسکول کھولے۔ زندگی کی عملی ضرورتوں کے مطابق سلیبس میں تبدیلیاں متعارف کروائیں۔ایک فرمان کے ذریعے ریاضیات کی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی۔فلسفہ' ادب' تاریخ کے ساتھ دیگر علوم کی تعلیم پر زور دیا۔ اکبر کی پالیسیوں کو جہانگیر اور شاہ جہاں نے برقرار رکھا لیکن اورنگ زیب نے فرقہ ورانہ پالیسی کو اختیار کیا' اس نے ایک طرف ہندو مدرسوں کو بند کروا دیا' دوسری طرف مسلمانوں کی تعلیم میں دنیاوی علوم کی حیثیت گھٹا کر دینیات کی اہمیت بڑھا دی۔جس میں مذہبی جنونیت کا عنصر غالب تھا۔انہی پالیسیوں کا نتیجہ تھا کہ مغل ریاست اور معاشرہ تیزی سے زوال پذیر ہوئے چنانچہ اورنگ زیب کی موت کے بعد بیرونی جنگجو سرداروں نے ہندوستان کی زمین کو یکے بعد دیگرے روند ڈالا۔مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دور حکومت میں تعلیم کبھی بھی مربوط اور منصوبہ بند سرگرمی نہ

رہی۔ اس کا وجود رضا کارانہ اور نشو ونما خود رو تھی۔ کسی مسلم بادشاہ نے تعلیم کے لیے کبھی الگ انتظامیہ بنانے کی ضرورت پر غور نہ کیا اور نہ ہی تعلیم کی ترویج کے لیے باقاعدہ فنڈز مہیا کرنے کا کوئی بندوبست کیا گیا تعلیم کے لیے ریاستی امداد غیر مستحکم اور خال خال ہی تھی۔ انھیں اپنی ریاست کے پھیلاؤ اور سونے چاندی کے انبار لگانے سے دلچسپی تھی' جنھیں ایک کے بعد دوسرا حملہ آور حکمران چھین لیتا' ہندوستان میں انگریزی تعلیم متعارف کروائے جانے تک کسی کو انقلاب فرانس' امریکہ کے اعلان آزادی' کارل مارکس اور آدم سمتھ کی سیاسی و معاشی تھیوریوں کا کوئی علم نہ تھا۔ یہاں پر ابھی تک الف لیلیٰ' سعدی و شیرازی اور عربی' فارسی کی گردانیں رٹ کر ''مولوی منشی فاضل'' تیار ہو رہے تھے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں نے تعلیم میں کوئی باقاعدہ دلچسپی لی۔ ان کے بنائے قلعے' محل' باغات اور مقبرے تو آج بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن اسکول' کالج' لائبریریاں یا تحقیقی اداروں کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ مسجدوں سے ملحقہ مکتبے یا دوسرے پرائیویٹ مدرسے غیر منظّم طریقے سے چلتے رہے۔ حکمران خاندان کے لیے خصوصی اتالیق مقرر کر دیے جاتے۔ تعلیم کا مقصد علم کا حصول نہیں بلکہ صرف نقل نویسی تھا۔ مغل یا دیگر مسلمان حکمرانوں نے کوئی ایسا تعلیمی نظام وضع نہ کیا جس سے کوئی ثقافتی انقلاب برپا ہوتا اور معاشرے کی مادی ترقی کا باعث بنتا۔

❖.....❖.....❖

انگریزوں کا دورِ حکومت اور تعلیم

ہمارے ہاں نوآبادیاتی نظام کو آزادی و غلامی کے محدود معنوں میں ہی دیکھا جاتا ہے جو کہ تصویر کا صرف ایک ہی ظاہری رخ ہے۔ قدیم زمانے سے ہی ایک قبیلہ دوسرے قبیلے پر اور ایک قوم دوسری قوم پر کیوں چڑھ دوڑتی رہی۔ ایک قوم غالب اور دوسری مغلوب کیوں ہو جاتی تھی اور اس ساری اتھل پتھل میں انسانی تہذیب اور تاریخ نے ترقی اور تبدیلی کی جانب اپنا سفر کیونکر جاری رکھا..... ایسی کھوج کا ذکر ہمارے ہاں کم ہی ملتا ہے۔ فطرت کو کسی خاص قوم کے ساتھ کوئی محبت نہیں رہی۔ نیچر اور تاریخ میں کسی کو کوئی رعائت حاصل نہیں ان کو صرف اور صرف اپنے قوانین عزیز ہیں' چنانچہ کوئی بھی قوم اپنے آپ کو خدا کی خصوصی اور پیاری قوم ہونے کا دعویٰ کتنا ہی کرے وہ تاریخ اور فطرت کے اٹل قوانین سے بچ نہیں سکی' حالات جیسے بھی ہوں جو خود کو دوسروں سے زیادہ فٹ ثابت کرتا ہے' کامیابی اور بقا اس کی قسمت میں آتی ہے۔ تاریخ روحانی قوانین یا کسی طرح کے عقائد سے واقف نہیں اگر ایک قوم دوسری قوم پر غالب آئی تو اس کا اس کے عقیدے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ دیگر تاریخی' تہذیبی اور ٹھوس مادی حقائق کارفرما تھے اور انہی حقائق سے روگردانی محکومیت کا باعث بنتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس سے قطع نظر کون غالب آیا ہے اور کون مغلوب ہو گیا' تاریخ اور تہذیب اپنے آگے بڑھنے کا عمل جاری رکھتی ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کون سی قوم ان قوانین کو سمجھ لیتی ہے اور خود کو غالب' سرگرم اور قائدانہ رول کی ادائیگی کے لیے تیار کرتی ہے۔

شاید ہماری اخلاقی رومانویت اس حقیقت کو قبول کرنے میں پس وپیش سے کام لے کہ زندگی، تاریخ اور کائنات میں ''طاقت ہی صداقت ہے'' کا قانون حرکت وعمل کے پس منظر میں چل رہا ہے۔ پرانے زمانے میں طاقت کا لفظ محدود معنے رکھتا تھا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جنگجو سردار اپنے قلیل گھوڑسوار جانباز ساتھیوں کی مدد سے اپنے سے نہ صرف عددی لحاظ سے زیادہ بلکہ تہذیبی لحاظ سے بھی برتر قوم کو روند ڈالتا تھا لیکن رفتہ رفتہ طاقت نے زیادہ گہرے، وسیع اور لطیف معنی اختیار کر لیے۔ علم طاقت کا سب سے بڑا وسیلہ بننا شروع ہوگیا۔ مادی وسائل کی طاقت بھی اسی کے قدموں میں ہے جس کے پاس اس فطرت اور کائنات کا علم سب سے زیادہ ہے۔ طاقت آج بھی اپنا اظہار ٹھوس مادی اشیاء سے ہی کرتی ہے لیکن اس مادی طاقت کو علم کی قوت اور آگہی کنٹرول کرتی ہے اور علم کو حاصل کرنے کا طریقہ تعلیم ہے۔

انگریزوں کے برصغیر میں آنے اور بعد میں قابض ہوجانے کو برا بھلا کہہ دینا بہت آسان.....لیکن تاریخ کے سارے عمل اور ننگی حقیقتوں کو سمجھنا ذرا وقت طلب کام ہے۔ فطرت کا عمل سیدھا سادا نہیں ہوتا وہ منفی سے مثبت اور مثبت سے منفی پہلوؤں کی تخلیق کرتا ہے۔ یہاں کے مسلم حکمرانوں نے کئی صدیوں سے عیش پرستی، باہمی چپقلشوں، علاقائی سازشوں اور علم وہنر سے بیگانگی کا کھیل رچا رکھا تھا۔ وہ برصغیر سے باہر ہونے والی تبدیلیوں سے بالکل بے خبر تھے۔ ہماری تاریخ کی کتابوں میں انگریزوں کے آنے پر تو بڑی تکلیف کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن یکے بعد دیگرے افغانی، ترکی، ایرانی اور وسطی ایشیا سے آئے نیم خواندہ غیر مہذب جنگجو مسلم قبائلی سرداروں کے ہندوستان پر قبضہ کر کے خاندانی بادشاہتیں چلانے پر کسی ملال کا اظہار نہیں کیا جاتا.....مزے کی بات ہے کہ ایک باہر سے آئے مسلمان بادشاہ کو کوئی دوسرا باہر سے آیا مسلمان جنگجو آور معزول کر کے خود تخت پر بیٹھتا رہا۔ عرب اور ایران سے حکمران تو پھر بھی قدرے تہذیب آشنا تھے لیکن حد یہ ہے کہ افغانستان سے اٹھ کر نیم وحشی نومسلم قبائل کے سردار محض اپنی حرب و بربریت کی مہارت پر دہلی آ کر بادشاہ بن جاتے ہیں، لیکن ہمارے مورخوں کی تیوریوں پر کوئی بل نہیں آتا،

افغانستان جو آج 20 ویں صدی کے آخر میں دنیا بھر کی اقوام کے سامنے ایک ناخواندہ، غیر مہذب، وحشت و بربریت پر مبنی باہم برسر پیکار قبائلی معاشرے کا نقشہ پیش کرتا ہے اور جہاں کے باشندوں نے ''جہاد'' کے نام پر اپنی سرزمین سے تہذیب کے سب نشان مٹا دینے کا تہیہ کر رکھا ہے، وہاں کئی سو سال پہلے جہالت کا کیا عالم ہوگا۔ لیکن چونکہ وہ کلمہ پڑھنا سیکھ چکے تھے لہٰذا ہماری نصابی کتابوں کے مصنفین کے نزدیک وہ مقدس قرار پاتے ہیں۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ انگریزوں کے برصغیر پر مکمل قبضہ ہونے تک ہندوستان کی عمومی اور بالخصوص مسلمانوں کی کیا ثقافتی حالت تھی۔ باضابطہ رسمی اور کسی منظّم نظام تعلیم کا کوئی نام ونشان موجود نہ تھا۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ انگریز اول اول تاجر بن کر ہندوستان آئے لیکن رفتہ رفتہ انھیں محسوس ہوا کہ ''سونے کی چڑیا'' احمق اور جاہل حکمرانوں کے ہاتھ میں ہے لہٰذا فطری طور پر انھوں نے یہاں پر اپنے دوررس سیاسی اواقتصادی عزائم بنا لیے۔ ہندوستان کے اکثریتی علاقوں پر قبضہ ہو جانے تک انگریزوں کو اس بات کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ وہ ہندوستانیوں کو تعلیم و تربیت کے جدید مواد اور طریقوں سے روشناس کروائیں، چنانچہ 1793ء میں جب ایک انسان دوست (Philanthropist) انگریز (William Wilberforc) نے ایسٹ انڈیا کمپنی پر زور دیا کہ کمپنی کے چارٹر ایکٹ میں دو دفعات (Clauses) شامل کی جائیں۔ جس کے مطابق انگلینڈ سے سکول ماسٹر انڈیا بھیجے جائیں لیکن ڈائریکٹرز کی کونسل نے مخالفت کی کہ ہندوستانیوں کی تعلیم کی ذمہ داری ہماری نہیں لیکن حالات کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ مطالبہ شدت اختیار کرتا گیا کہ کمپنی ہندوستان میں تعلیمی سرگرمیوں کو بھی اپنی ذمہ داری بنائے چنانچہ 1813ء میں کمپنی چارٹر میں ترمیم کی گئی جس کے مطابق ایک لاکھ روپے تعلیم پر خرچ کرنے کی اجازت دی گئی۔ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار معین اوقات کی حامل ایک باقاعدہ کلاس کا تصور متعارف کرایا گیا۔ ایک منظّم اور وسیع تر نصاب وضع کیا، تعلیم کی انتظامیہ کے لیے علیحدہ محکمہ کھولا گیا۔ شروع میں انگریزوں کو پرائمری تعلیم کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ظاہر ہے ہندوستانیوں کی

یونیورسل ناخواندگی ان کا مسئلہ نہیں تھا لہٰذا سب سے پہلے کلکتے، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں بنائی گئیں اور ان کے لیے گرانٹ کا نظام قائم کیا گیا۔

لارڈ کرزن 1898ء میں جب وائسرائے بن کر آیا تو اس نے برصغیر کی تعلیمی حالت زار کو بہتر بنانے کا عزم کیا۔ اس وقت ہندوستان میں پانچ سے چار دیہات اسکول اور 4 میں تین بچے تعلیم کے بغیر تھے اور 40 میں سے صرف ایک لڑکی کسی طرح کے اسکول میں حاضر ہوتی تھی۔ لارڈ کرزن بحیثیت وائسرائے کلکتہ یونیورسٹی کا چانسلر بھی تھا۔ اس نے 1901ء میں ایک تعلیمی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے برصغیر کے تعلیمی مسائل پر ایک ایسی تقریر کی جو ہمارے آج کے حالات پر بھی صحیح دکھائی دیتی ہے۔ اس سے انگریزوں کی نہایت گہری نظر کا پتہ چلتا ہے ''جب میں ہندوستانی کالجوں کے ہزاروں نوجوانوں پر غور کرتا ہوں جو ناختم ہونے والے سلسلہ امتحانات میں زیادہ سے زیادہ فیصد نمبروں کے حصول کے لیے مسلسل پسے جا رہے ہیں تو یہ اس منظر سے کم افسوسناک نہیں جو تبت میں ان بھکشوؤں کو دیکھ کر ہوتا ہے جو عبادت کے پہیے کو میکانکی طور پر مسلسل گھماتے رہتے ہیں۔ ان آوازوں کی تکرار کے ساتھ جن کے مطالب کا مفہوم خود انھیں بھی نہیں ہوتا لیکن وہ سوچ ہے ہوتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ان کی ابدی نجات گھیرے میں آ رہی ہے۔ میں صرف نظام امتحان کے نتائج کا ہی نہیں بلکہ اس کے شکار طلباء پر پڑنے والے اثرات کا بھی ذکر کر رہا ہے ہوں۔

کیا قوم کی دانش کی قیمت ادا کر کے صرف قابل عزت کلرک اور وکیل ہی بنانے ہیں۔ رٹے کی عادت پیدا کر کے لوگ کسی طور بھی ذہانت کے پیمانے کو عبور نہیں کر سکتے۔ یادداشت (Memory) بذات خود دماغ (Mind) نہیں ہے وہ ذہن کی صرف ایک صلاحیت (Faculty) ہے لیکن ہم پھر بھی طلباء کی یادداشت کو تیز کیے جاتے ہیں ان کے ذہنوں کی یادداشت کے امتحان (Memory Tests) لیتے ہیں۔ اساتذہ بھی طلباء کی طرح وہی بنیادی غلطی کیے چلے جا رہے ہیں۔ طلبا کی ذہنی اور اخلاقی ترقی کی طرف سوچنے کی بجائے وہ جدولی

نتائج، فیصد نمبروں اور صرف پاس ہونے کے چکروں میں پڑے ہیں۔ یہ پانی پر پڑی وہ لکیر ہے جس سے ہمیں ہندوستانی تعلیم کو اٹھانا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وہ دلدل کے اندر دھنس کر دم توڑ دے۔''

لارڈ کرزن آگے چل کر کہتا ہے۔ ''ہم کرنا یہ چاہتے ہیں کہ مروجہ امتحانات سے بہتر ایسے امتحانات کا طریقہ نکالا جائے جو طلباء کی صحیح صلاحیت کو سامنے لائیں۔ ہمیں رٹے کی خاطر ہر چیز کی قربانی دینا بند کرنا ہوگا اور اعلیٰ درجے کے اساتذہ کو لاکر احسن طریقہ و تدریس سے طلباء کو پڑھانا ہوگا۔ کالجوں اور انسٹی ٹیوٹ کی کڑی نگرانی کرنی ہوگی جنہیں آج کل اپنے ہی حال پر چھوڑا ہوا ہے۔ یونیورسٹیوں کی انتظامیہ لائق، ماہر اور پرجوش ہاتھوں میں ہونی چاہیے۔ سینٹ کی از سرنو ھیئت ترکیبی بنانی ہوگی۔ سنڈیکیٹ کے اختیارات کو مزید منضبط کرنا ہوگا تاکہ ہماری یونیورسٹیاں صحیح معنوں میں تعلیم کے اعلیٰ ادارے بن سکیں نہ کہ ان کا وجود محض نمائش اور دھوکہ بن کر رہ جائے۔''

کیا مندرجہ بالا تقریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی سامراجی حکمران کی تقریر ہے جو اپنے غلام باشندوں سے مخاطب ہے۔ کیا اس سے قبل ہندوستان کی ایک ہزار سالہ تاریخ میں کسی مسلم حکمران کو اپنے عوام کی تعلیمی حالت زار پر ایسی تقریر کرنے کی توفیق ہوئی اور بات ماضی کے اپنے حکمرانوں پر ہی موقوف نہیں ہے۔ آزادی کے 60 سال بعد بھی کیا ہمارا نظام تعلیم سو فیصد وہی تصویر پیش نہیں کر رہا جس کی طرف اشارہ لارڈ کرزن 1901ء میں کرتا ہے۔ کیا پچھلے ساٹھ سال میں کسی حکمران نے تعلیم کو اپنی پہلی ترجیح قرار دیا ہے؟

''سامراجی'' انگریزوں کے ہم پر کیا کیا تعلیمی احسانات ہیں اس کے لیے ہمیں لارڈ میکالے اور سرسید احمد خاں کے بارے میں تفصیل جاننا نہایت ضروری ہے۔

❖.....❖.....❖

لارڈ میکالے.....محسن اول

برصغیر میں جدید تعلیم کا بانی

ایک لحاظ سے تاریخ میں سامراجیوں کو تین طرح سے تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک جنھوں نے محکوم اور مقبوضہ اقوام کی تہذیب وثقافت کو تاراج کیا اور مال ومتاع لوٹ کو چلتے بنے۔ دوسری قسم مغربی اقوام کی تھی جو سامراجی استحصال کے ساتھ جاتے جاتے ایک ترقی یافتہ تہذیب وثقافت کے اثرات بھی جھولی میں ڈال گئے۔ تیسری قسم مسلمانوں کی فتوحات اور بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرنے کی ہے لیکن اسے ہم لوگ سامراجیت کے زمرے میں نہیں لاتے یہاں ہمارے جذبات مختلف ہو جاتے ہیں۔ سامراجیت کوئی بھی ہو اس کا بنیادی مقصد اپنے دائرہ اقتدار کو بڑھانا دوسری قوم کے افرادی اور مادی وسائل کو اپنے زیر استعمال کرنا اور ان پر اپنے بلند و بالا تاج وتخت کھڑے کرنا ہوتا ہے۔ عقائد اور دیگر روحانی واخلاقی پہلو ثانوی رول ادا کرتے ہیں اور اول الذکر مقصد کو ہی مدد دے رہے ہوتے ہیں لیکن ہمارے ان ہم عقیدہ باہر سے آئے حکمرانوں نے اپنے ایک ہزار سالہ دور حکومت میں تہذیب وثقافت کا کوئی ایسا تحفہ نہیں چھوڑا جس پر ہم کسی بھی طرح کا فخر کر سکیں اور جو آج یا کل ہمارے کسی کام آنے والا ہو۔ بس بے حال اور بے یارو مددگار مسلم آبادی چھوڑ گئے۔ جسے ہم ان کا شاندار دور کہتے ہیں وہ بنیادی طور پر جمود کا زمانہ تھا جو زوال کی طرف گامزن ہو کر 1857ء میں بدترین شکل اختیار کر کے اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

نئی نسل کو ہمارے بزرگوں نے آج تک یہی بتایا ہے کہ لارڈ میکالے سے بڑا ہمارا تعلیمی دشمن کوئی نہیں تھا جس نے یہاں پر انگریزی تعلیم رائج کر کے ہماری ''مشرقیت'' اور خودی کو چھین لیا۔ لوگ جدید تعلیم حاصل کر کے 'براؤن صاحب' بن گئے چنانچہ ہماری تاریخ میں لارڈ میکالے کا لفظ منفی معنوں میں ایک محاورہ بن چکا ہے۔ کسی قوم کی اس سے بڑی احسان کشی کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ جب ہم لارڈ میکالے کو برا کہتے ہیں تو ایک ہزار سالہ اپنے ثقافتی جمود اور زوال کو بھول جاتے ہیں کہ ہم اس وقت جہالت اور بے علمی کی کیسی دلدل میں پھنس چکے تھے اور اس بات کو بھی کہ اس عرصے کے دوران دوسری طرف مغربی اقوام میں فلسفہ و سائنس ترقی کی کتنی منزلیں طے کر چکے تھے جس سے ہم قطعی بے خبر تھے۔ ہمارے ہاں یونیورسل ناخواندگی کے ساتھ جو معمولی سی تعلیم تھی۔ اس کا زیادہ حصہ قدیم عربی و فارسی ادب اور مذہبیات پر مشتمل تھا۔ ہمارے مکتبوں اور مدرسوں میں سائنسی علوم کی تدریس نہ ہونے کے برابر تھی اور جو سائنس پڑھائی جاتی تھی وہ متروک ہو چکی تھی۔ پچھلے ہزار سالہ ہندوستان کے اسلامی دور حکومت میں نہ کوئی قابل ذکر علمی تحقیق ہوئی۔ نہ علوم میں کچھ اضافہ ہوا۔ چنانچہ اس زمانے کے نظام تعلیم پر ایک عیسائی منشنری Alxander Duff نے تبصرہ ان الفاظ میں کیا۔

"The Indians Education is a Worthless Metaphysical Subtlety."

''ہندوستانی تعلیم موشگافیوں پر مشتمل ایک بے کار مابعد الطبیعات کا نام ہے۔''

اس لیے کہ اس تعلیم کا روزمرہ کی انسانی جدوجہد سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ ہم مسلمانوں کو آج تک اس راز کا پتہ نہیں چلا کہ جو علم مادی ترقی نہیں دے سکتا وہ روح کی نشوونما کے لیے بھی بے کار ہوتا ہے۔ ہندوستان کے مسلم عوام صدیوں سے علمی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے اور حیرت کی بات ہے کہ جوں جوں غلامی اور زوال کے عمیق گڑھے میں گر رہے تھے۔ وہ نیند سے بیدار ہونے کی بجائے اسی تاریکی کو گلے لگائے رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ کبھی وہ مغل بادشاہت کے مردہ جسم میں روح ڈالے جانے کے خواب دیکھتے۔ کبھی وہ دم توڑتی خلافت

عثمانیہ کو بچانے کی سعی لاحاصل کرتے.....کبھی وہ انگریزی تعلیم کا بائیکاٹ کرتے..... گویا ہندوستانی مسلمانوں نے تاریخ کے الٹ چلنے اور وقت کے اشاروں کو نہ سمجھنے کا تہیہ کر رکھا تھا..... اور اللہ کے فضل سے ہم برصغیر کے مسلمانوں کا یہ مزاج آج تک نہیں بدلا۔ تاریخ اور وقت کا بڑے سے بڑا حادثہ ہماری طرز فکر میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکا! لیکن وقت کے سامنے آپ کتنا ہی دیوار بننے کی کوشش کریں تاریخ اپنے رستے بنانا جانتی ہے۔

چنانچہ جہالت کی خوگر محکوم قوم میں جدید نظریہ تعلیم کا چراغ روشن کرنے 1835ء میں لارڈ میکالے ہندوستان آتا ہے' ایسٹ انڈیا کمپنی اب بھی ہندوستانیوں کو جدید تعلیم دینے میں لیت ولعل سے کام لے رہی تھی۔ وہ اب بھی یہی چاہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ اپنی روایتی دقیانوسی تعلیم حاصل کرنے میں مشغول رہیں۔ ہندو سنسکرت پڑھتے رہیں اور مسلمان عربی وفارسی کے مولوی پیدا کرتے رہیں۔ لارڈ میکالے نے ہندوستانیوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں سے جو لڑائی لڑی اس سے یہ بات غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ برصغیر میں انگریزوں کا ایجنٹ بن کر آیا تھا یا اس کا مقصد ہندوستانیوں کو ذہنی طور پر غلام بنانا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ انگریزی تعلیم نے ہندوستانیوں کو زندگی اور آزادی کے معنی سکھائے اور اس انگریزی تعلیم کا اعجاز تھا کہ یہاں سرسید' اقبال' نہرو اور جناح پیدا ہوئے۔ جن کی جدوجہد کے نتیجے میں برصغیر کے عوام کو اپنے اپنے آزاد وطن نصیب ہوئے۔

آیئے دیکھتے ہیں لارڈ میکالے نے ہم پر کیا ظلم کیے۔ میکالے نے تعلیم پر ایک تفصیلی رپورٹ تیار کر کے حکومت برطانیہ کو پیش کی' جس میں اس نے اس بات پر زور دیا کہ حکومت برطانیہ مقامی ہندوستانیوں میں یورپی علوم اور لٹریچر کے فروغ کو اپنا فرض اولیں بنائے اور تعلیم کے لیے مختص شدہ فنڈز دیسی تعلیم کی بجائے جدید تعلیم پر خرچ کیے جائیں۔ لارڈ میکالے حکومت کو تاکید کرتا ہے کہ وہ مسلم اور ہندو تعلیم کی حوصلہ افزائی بند کر دے۔ اس سلسلے میں وہ یہاں کی روایتی تعلیم کی ''خوبیوں'' کو چیلنج کرتا ہے اور عوام تک مغربی تعلیم پہنچانے کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ مارچ

1835ء سے ہی انگلش انڈیا کی سرکاری زبان بن چکی تھی۔ میکالے اس بات پر زور دیتا ہے کہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنا کر برطانوی (مقبوضہ) علاقوں کے باشندوں میں سائنسی علوم کو فروغ دینا' تعارف کرانا اور ترقی دینا مقصود ہے۔ وہ دلیل پیش کرتا ہے کہ ہندوستانی طلباء کے لیے سنسکرت' عربی اور انگریزی تینوں ہی اجنبی (Unknown) زبانیں ہیں' سنسکرت اور عربی میں کوئی مفید علم موجود نہیں اور مغربی علوم کا کلاسیک مشرقی زبانوں میں ترجمہ کرنا یوں فضول ہے کہ یہ ایک بہت بڑا کام ہے۔ ''تعلیم میں سنسکرت اور عربی کا مطالعہ محض فالتو گری میں شامل ہے۔ فی الواقع طالب علم اور جدید تعلیم کے درمیان یہ دونوں زبانیں ایک ناقابل عبور رکاوٹ بنی ہوئی ہیں' ظاہر ہے کہ اگر نصاب کو جدید بنانا ہے تو ذریعہ تعلیم انگریزی زبان ہی ہونی چاہیے۔'' لارڈ میکالے کی باتیں جذبات سے نہیں عقل سے سمجھ میں آئیں گی۔ ہمیں مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کرنے چاہیے' میکالے کا یہ کہنا کہ برصغیر کے عوام کے لیے سنسکرت' عربی و فارسی اور انگریزی سبھی ایسی زبانیں ہیں جنھیں وہ نہیں جانتے تو اس میں کون سی غلط بات ہے۔ ہزاروں سال سے سنسکرت ایک چھوٹے سے حکمران ہندو برہمن طبقے تک محدود تھی۔ عربی و فارسی غیر ہندوستانی زبانیں تھیں۔ جنھیں حکمران اپنے ساتھ باہر سے لائے تھے۔ ہزار سالہ مسلم دور اقتدار کے باوجود عربی' فارسی میں سے کوئی بھی ہندوستانی عوام کی زبان نہ بن سکیں۔ ان کا علم نہایت قلیل اشرافیہ تک محدود رہا۔ اب سوال یہ ہے کہ انگریزی بھی لوگوں کی زبان نہ تھی تو پھر انگریزی کو ترجیح دینے کی کیا منطق تھی۔ میکالے اس کے لیے بھی بڑی ٹھوس دلیل پیش کرتا ہے کہ تعلیم اگر جدید علوم کی دینی ہے تو اس کے لیے وہی زبان مناسب ترین قرار دی جاسکتی ہے جس میں یہ جدید علوم موجود ہیں اور ان جدیدی علوم نے جس زبان میں جنم لیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے پہلے تو ہم صدیوں تک سوئے رہے نہ کسی علم کو جنم دیا نہ کسی علم میں اضافہ کیا' حتیٰ کہ فرنگیوں کے غلام بھی ہو گئے اور اس کے بعد شکایت کر رہے ہیں کہ ہم جدید تعلیم انگریزی میں کیوں حاصل کریں گویا فرنگی حکمران ہمیں جدید علوم سے آشنا بھی کرتے اور ان علوم کو ہماری پسندیدہ اور ''مقدس'' زبانوں میں ترجمہ بھی کر کے دیتے

جو ہمارے لیے خود بھی اجنبی تھیں.....!

انڈین زبانوں کا ثقافتی معیار کیا تھا اس کے بارے میں لارڈ میکالے کہتا ہے ''تمام جماعتیں اس نکتہ پر اتفاق کرتی ہیں کہ انڈیا کے مقامی لوگ جو عام زبان بولتے ہیں۔ اس میں لٹریری اور نہ ہی سائنسی معلومات پائی جاتی ہیں' مزید برآں وہ اتنی ضعیف اور غیر متمدن ہیں کہ جب تک انھیں کوئی اور مالا مال نہ کرے ان میں کسی طرح کا قابل قدر کام ترجمہ نہیں ہوسکتا.....'' ہندوستانی زبانوں کی حالت زار پر اس سے زیادہ حقیقت پسندانہ تبصرہ اور کیا ہوسکتا ہے اور یہ بات ان تعلیمی ماہرین کی آنکھیں بھی کھول دینے کے لیے کافی ہے جو آج بھی ''اپنی'' زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے پر اصرار کرتے ہیں' گھر بیٹھے اپنی مشرقی زبانوں کو فصیح و بلیغ (RICH) کہہ دینا اور بات ہے اور لارڈ میکالے کی دلیل کا جواب دینا دوسری بات ہے وہ کہتا ہے ''میں نے مستشرقین (Orientalists) میں بھی کوئی ایسا بندہ نہیں دیکھا جو اس حقیقت سے انکار کر سکے کہ عربی اور انڈین زبانوں کا سارا لٹریچر اکٹھا کر دیا جائے تو بھی اس کا مقابلہ کسی اچھی یورپین لائبریری کے ایک شیلف سے نہیں کیا جاسکتا۔'' آج عرب انگریزی کے مقابلے میں اپنی زبان کی پس ماندگی کا احساس کر رہے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ انگریزی سیکھنے اور اسے ذریعہ تعلیم بنانے کو ترجیح دے رہے ہیں لیکن ہمارے یہاں کے ''ماہرین لغات'' عربی اور فارسی کے ناقابل فہم الفاظ سے بنائی گئی اصطلاحوں کی بنیاد پر اپنی زبان کو انگریزی کے متبادل قرار دیتے ہیں حالانکہ عربی اور فارسی سے مستعار الفاظ ہمارے لیے انگریزی الفاظ سے زیادہ اجنبی اور دقیق الفہم ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے طالب علم کے لیے ''ذواضعاف اقل'' کی بہ نسبت L.C.M کو سمجھنا زیادہ آسان ہے۔ اگر طالب علم کو نئی لغت ہی سکھانی ہے تو پھر وہ انگریزی کیوں نہ ہو.....ہمیں یہی بات مان لینی چاہیے کہ صدیوں کے ثقافتی' علمی اور تکنیکی جمود سے ان دیسی اور مشرقی زبانوں میں اتنے بڑے گیپ پیدا ہو چکے ہیں جنھیں اب مصنوعی اور شعوری طریقے سے نہیں پاٹا جاسکتا۔ ادھر مغرب میں علم کی مقدار بڑھنے کا یہ عالم ہے کہ ہر چند سال کے بعد علم کی عالمی مقدار دوگنی ہو جاتی ہے۔ جیسے

ہماری ٹیکنیکل اور اقتصادی پس ماندگی ایک حقیقت ہے اس طرح فرانسیسی، جرمن اور انگریزی کے مقابلے میں ہماری زبانوں اور ثقافتوں کی پس ماندگی ایک حقیقت ہے حتیٰ کہ اب سٹیلائٹ ذرائع اطلاعات، کمپیوٹر اور سائیبر سپیس (Cyber Space) ایک کیفیتی تبدیلی پیدا کر رہے ہیں اور دنیا ایک عالمی قریے میں بدل رہی ہے۔

لارڈ میکالے آگے چل کر کہتا ہے، ''میں نے کسی مستشرق (Orientalist) کو یہ ثابت کرنے کی جرات کرتے نہیں دیکھا کہ عربی اور سنسکرت کی شاعری کا مقابلہ یورپی اقوام کی شاعری سے کیا جا سکتا ہے'' لارڈ میکالے کا جذبات اور احساسات کے حوالے سے زبانوں کا یوں مقابلہ کرانا شاید صحیح نہ ہو لیکن جہاں حقیقی فرق ہے وہ اس پر یوں روشنی ڈالتا ہے، ''لیکن ہم تصوراتی کام سے اس کام کی طرف آتے ہیں جہاں حقائق نوٹ کیے جاتے ہیں اور عمومی اصولوں کی تحقیق کی جاتی ہے، یہاں پہ آ کر یورپی زبانوں کی برتری قطعی طور پر ناقابل پیمائش ہے'' یعنی جہاں تک تحقیقی سائنسی علوم کا تعلق ہے مشرقی زبانوں کا مغربی زبانوں سے کوئی مقابلہ نہیں ہے، بقول میکالے، ''میں سنسکرت اور عربی زبان نہیں جانتا لیکن ان کی صحیح قدر و منزلت جاننے کے لیے میں جو کر سکتا تھا وہ میں نے اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ میں نے مشرقی علوم کے تراجم کو پڑھا ہے اور بلا مبالغہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ سنسکرت زبان کی تمام کتابوں میں اتنا بھی علم موجود نہیں جتنا انگلینڈ کے پرائمری جماعتوں کی کتابوں کے خلاصے میں موجود ہو سکتا ہے.....!! جب صورت حال یہ ہے تو پھر معاملہ کہاں پر بیٹھتا ہے؟ ہم نے ان لوگوں کو تعلیم دینی ہے جو فی الوقت اپنی مادری زبان کے ذریعے تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمیں لازماً انھیں کوئی نہ کوئی غیر ملکی زبان ہی پڑھانی ہوگی تو پھر انگریزی کے سوا اور کوئی بہتر نہیں ہے۔'' وہ لکھتا ہے، ''یہ ایک عالمی اعتراف ہے کہ کسی بھی مضمون پر کہیں ایسی کتابیں موجود نہیں ہیں جن کا مقابلہ ہماری کتابوں سے کیا جا سکے۔ اس پر جس کسی نے اختلاف کیا ہے وہ مقابلے میں گھٹیا چیز ہی سامنے لایا ہے۔ مثال کے طور پر ان مشرق والوں کی ''علم فلکیات'' ہمارے انگریزی اسکولوں کے بچوں کے لیے تمسخر کا باعث ہی ہو سکتی ہے.....اور

ان کی تاریخ ایسے بادشاہوں کے قصوں سے بھری ہوئی ہے جن کے قد تیس فٹ اونچے تھے جنھوں نے تیس تیس ہزار سال حکومت کی.....! اور ان کے جغرافیہ میں ''شیرے اور مکھن کے سمندر'' پڑھانے پڑیں گے۔''

''میں کسی طور پر بھی تسلیم نہیں کرسکتا کہ جب ایک اعلیٰ درجے کا علم و دانش حاصل کر لینے والی قوم کو ایک ایسی قوم کی تعلیم کی ذمہ داری اٹھانی پڑے جو مقابلتاً کم علم ہو تو پڑھانے والوں کی یہ ذمہ داری ہونی چاہیے کہ کیا اور کس طرح کا نصاب مرتب کیا جائے۔ یہ بہت برا ہوگا کہ ناخواندہ قوم کی دانش ورانہ صحت کی قیمت پر ان سے علمی ذوق کے بارے میں مشورہ کیا جائے.....'' لارڈ میکالے کی یہ دلیل بھی بڑی ٹھوس دکھائی دیتی ہے کہ جس طرح صاحب علم اور ماہرین تعلیم ہی نصاب مرتب کر سکتے ہیں' جہلاء کو اپنا نصاب خود مرتب کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی اس لیے کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ خود ان کی بہتری کس میں مضمر ہے اسی طرح (اگر موقع آن پڑے) تو تعلیم یافتہ قوم ہی بہتر فیصلہ کرسکتی ہے کہ ایک ناخواندہ اور صدیوں سے جاہل قوم کا بہتر مستقبل کس طرح کی تعلیم میں محفوظ ہوسکتا ہے' لارڈ میکالے کو کوئی تکلیف نہ تھی کہ ہندوستانیوں کو ایسی زبانیں اور قدیم روایتی علوم ہی پڑھائے جاتے وہ تو ہماری ذہنی صحت "Intellectual Health" کی فکر کا اظہار کرتا ہے چنانچہ لارڈ میکالے اس نتیجے پر پہنچتا ہے۔ اس کے الفاظ میں' ''ہم عربی اور سنسکرت کے کالجوں میں جو بھی رقم خرچ کر رہے ہیں وہ صداقت کے کاز کے حوالے سے سراسر نقصان ہے۔ یہ وہ سرکاری امداد ہے جو غلط فکر کے چمپئین پیدا کرنے میں استعمال ہو رہی ہے۔ اس رقم سے ان کٹر پسندوں کا اڈہ بنے گا جو اپنے جذبات اور مفادات کی خاطر تعلیم کی ہر مفید اسکیم کے خلاف شور پیدا کریں گے۔'' وہ ایسے مدرسوں سے پیدا ہونے والی بنیاد پرست اور ترقی دشمن قوتوں کے بارے میں کہتا ہے' ''میں مانتا ہوں کہ لٹریچر (دیسی) پڑھانے کی ایک خفیف قدر ہے لیکن یہ وہ رستہ ہے جو عقل' اخلاق اور سب سے بڑھ کر غیر جانبداری کے اصول سے میل نہیں کھاتا جس کے تقدس کو ہم ہر حالت میں محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔'' یہاں پر لارڈ

میکالے ان خطرات کا ذکر کرتا ہے جو دیسی اور روایتی تعلیم کے مدرسوں سے بند ذہن کے حامل، تنگ نظر، مذہبی جنونی اور بنیاد پرست پیدا ہوں گے۔ جو کسی بھی معاشرے کی سماجی ترقی کے لیے بہت بڑا خطرہ اور رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ صرف جدید تعلیم ہی روشن خیال اور سائنسی فکر کے حامل افراد پیدا کر سکتی ہے جو معاشرے کو مسلسل آگے لے جانے کا باعث بنتے ہیں۔

آگے چل کر میکالے کہتا ہے ''یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ ان (دیسی اور مشرقی) زبانوں میں کوئی مفید علم موجود نہیں ہے ہمیں غلط تاریخ اور فرضی و باطل فلکیات پڑھانی ہوگی کیونکہ یہ ان کے مذہبی عقائد کا حصہ ہیں۔ یہ وسیع پیمانے کی توہم پرستی پر نہایت صدق دل سے ایمان رکھتے ہیں کیا ہم ریاست کے پیسوں سے ان ہندوستانی نوجوانوں کو یہ پڑھائیں کہ وہ گدھے کو چھو لینے کے بعد اپنے کو کیسے پاک رکھ سکتے ہیں اور اگر آپ سے کسی بکری کی موت ہو جائے تو کون سے مقدس کلمات پڑھنے سے آپ کے گناہ کی تلافی ہو جائے گی۔'' میکالے اس وقت کے تعلیمی مقاصد کا ذکر یوں کرتا ہے ''برصغیر کے لوگوں کو مغربی تعلیم دینے کے بہت سے مقاصد ہیں، پہلا مقصد یہ ہے کہ انتظامیہ کے مختلف شعبوں کے لیے دفتری عملہ تیار کیا جائے دوسرا مقصد سیکولر تعلیم کے ذریعے مقامی لوگوں کے نقطہ نظر میں وسعت پیدا کی جائے اور ان کی مدد کی جائے کہ وہ جنونی مذہبی شکنجے کی گرفت کو ڈھیلا کر سکیں جو برطانوی حکومت کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔'' دیکھا جائے تو میکالے نے جو مقاصد اس وقت بیان کیے تھے وہ آج کے کسی بھی معاشرے اور ریاست کے لیے مفید ہیں، ہمارے ہاں کے کچھ اہل دانش یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انگریزوں کا ہمیں مغربی تعلیم دینے کا سب سے بڑا مقصد ہمارے اوپر مغربی علوم اور ثقافت کی برتری قائم کرنا تھا۔ سوال کسی کے برتر اور کمتر ہونے کا نہیں ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مغرب مادی و سماجی علوم میں ہم سے بہت زیادہ ترقی کر گیا۔ اب وہ علوم ساری انسانیت کا مشترکہ اثاثہ ہیں اور جہاں تک ثقافت کا تعلق ہے۔ علوم کی ترقی اور ارتقا کے عمل کے رک جانے سے ثقافتیں بھی کمزور پڑ جاتی ہیں، جمود کی وجہ سے وہ بھی بوسیدہ ہو جاتی ہیں، ثقافت کے نام پر پس ماندہ طرز زندگی کی

حفاظت علم کے بنیادی تقاضوں کے منافی ہے۔ثقافت کے پودے کوعلم کا تازہ پانی جب نہ ملے تو وہ مرجھا جاتا ہے۔مغرب کے مقابلے میں پس ماندہ قوموں کی ثقافتوں کومحض انا پرستی میں آ کر فوقیت دینا جائز نہ ہوگا۔سب سے بڑھ کر آج کے انسان کا ہر انگ گلوبل اور یونیورسل زاویہ اختیار کر رہا ہے۔وہاں مشرق ومغرب کے ثقافتی فرق کی بحث فضول ہوتی جارہی ہے۔صنعتی اور بعداز صنعتی معاشروں کی ثقافتوں میں مشرق ومغرب کا فرق کم ہی رہ جائے گا۔

❖.....❖.....❖

سرسید احمد خان.....محسن اعظم

برصغیر ہی کیا پوری مسلم تاریخ میں سرسید جیسی کوئی اور شخصیت نظر نہیں آتی جنھوں نے انتہائی دردمندی کے ساتھ ملت اسلامیہ کی مادی و ذہنی پس ماندگی کی وجوہات تلاش کرنے کی سعی کی ہو اور پھر اس کی اصلاح احوال کے لیے اپنے دن رات ایک کر دیے ہوں جو کئی صدیوں کے ثقافتی جمود کی وجہ سے مغربی اقوام کے مقابلے میں ''جانوروں کی سی حیثیت'' اختیار کر چکی تھی۔

ان پڑھ معاشرہ غیر جمہوری ہوتا ہے چنانچہ قومی معاملات میں عوام کی عدم شرکت کی وجہ سے کچھ قوتیں پس پردہ حکمرانی کا منصب سنبھال لیتی ہیں اور ان پڑھ قوم کے نظریاتی گاڈ فادر کا کردار ادا کرنے لگتی ہیں جس سے پس پردہ قوتوں کا مقصد اپنے مادی اور دنیاوی مفادات کو تحفظ اور دوام دینا ہوتا ہے ان قوتوں کو عرف عام میں اسٹیبلشمنٹ کہتے ہیں۔ آزادی کے بعد پاکستان پر قابض اسٹیبلشمنٹ نے سرسید کے دوقومی نظریے کا چرچا تو خوب کیا جس کی وجہ سے انھیں کروڑوں مسلم عوام کی قسمت کا مالک اور ایک عظیم الشان ملک پر حکمرانی کا فری لائیسنس ملا تھا' لیکن اس بات کی کوشش کی گئی کہ سرسید کے افکار اور اس کی سرگرمی حیات سے آنے والی نسلوں کو بے خبر رکھا جائے چنانچہ آج لوگ سرسید کے بارے میں دو لفظی بات ہی جانتے ہیں کہ انھوں نے خیرات وغیرہ اکٹھی کر کے علی گڑھ کالج بنایا تھا۔

اگر ہندوستانی مسلمانوں میں سرسید پیدا نہ ہوتے (یا لارڈ میکالے ہندوستان نہ آتا) تو آج ہم مسلمانوں میں تعلیم اور جدید علوم کی پڑھائی کا نشان مشکل سے ملتا۔ یونیورسٹیوں کی

بجائے مسجد مکتب ہوتے جہاں ہمارے بچے ٹوپیوں اور پاجاموں میں ملبوس اونچی لے میں مولوی کے مقدس رعب تلے ب بکری کا رٹا لگا رہے ہوتے' میڈیکل کالجوں کی جگہ حکیم حضرات کشتے تیار کرنے میں مصروف ہوتے اور انجنیئرنگ یونیورسٹیوں کی جگہ دست کاروں کی جلوہ نمائی ہوتی۔ اشرافیہ مجروں اور تیتر بٹیروں سے دل بہلا رہی ہوتی اور انٹلیکچول عربی' فارسی کے عشقیہ شعروں میں موشگافیاں تلاش کر رہے ہوتے' چنانچہ سرسید اس نتیجے پر پہنچے کہ جدید مغربی تعلیم وعلوم کے بغیر بد حال ملت اسلامیہ کے سب دیگر نعرے بے معنی ہیں صدیاں بیت چکی تھیں مسلمانوں کا علم دوستی' تحقیق پسندی اور عقل کو خدا حافظ کہے۔

بقول سرسید ''مسلمان سمجھتا ہے کہ معاشرہ جامد اور اس کی اقدار مقدس ہوتی ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی بستی ہو یا قوم' تبدیلیاں ان کی زندگیوں میں وارد ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ مسلمانوں نے خدا کے ساتھ کئی اور خدا اور رسول کے ساتھ کئی اور رسول بنا رکھے ہیں' صدیوں پرانے رسم ورواج توہم پرستی اور عادات ان کے ایمان کا جزو بن چکے ہیں۔ تہذیب ایک ایسا لفظ ہے جس کے وسیع معنی ہیں وہ ایک ایسی ہمہ گیر ترقی کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں تمام انسانی اقدامات' اخلاق' سماجی برتاؤ رہن سہن اور وقت صرف کرنے کے طریقے علوم' فنون اور کرافٹس ہر دم شائستگی اور عمدگی کے اعلیٰ درجوں کی طرف رواں دواں ہوں تاکہ انسان کی ذہنی مسرت' جسمانی تندرستی اور اس کے عزت ووقار کو یقینی بنایا جائے چنانچہ ہمیں ان تمام اطوار کو ترک کر دینا چاہیے جو تہذیبی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوں''۔

مسلمانوں کی تعلیم سے بے رخی کا یہی عالم تھا کہ دسمبر 1886ء میں سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں سفارش کی گئی کہ ہر مسلمان اپنی آمدنی کا ایک فیصد جمع کرائے تاکہ اس پیسے کو ان کے اپنے علاقے کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ کے لیے خرچ کیا جائے۔ طے پایا کہ اس فنڈ سے ذہین لیکن مفلس مسلمان نوجوانوں کی مدد کی جائے گی جن کی عمر 19 سال ہوتا کہ وہ میڈیکل' انجنیئرنگ اور قانون کی اعلیٰ ڈگریاں لے کر انڈین سول سروس کا

امتحان پاس کرسکیں۔ سرسید چاہتے تھے کہ 500 فراخ دل مسلمان آگے آئیں جو ہر ماہ دو روپے چندہ دیں، لیکن صرف 300 مشکل سے راضی ہوئے جس سے 4000 روپے کی رقم اکٹھی ہوئی چنانچہ حمایت نہ مل سکنے کی وجہ سے پروگرام ناکام ہوگیا اور سرسید کو اسے بند کرنا پڑا۔

سرسید نے ایک بار کہا ''فی الوقت مسلمان بے معنی تعصّبات کے زیر اثر چل رہے ہیں اور انھیں اپنی فلاح و خیریت کی کوئی سمجھ نہیں۔ ایک تو یہ جھوٹے احساس تفاخر میں زندہ ہیں دوسرے مفلس اور پس ماندہ ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے مصائب دوچند ہوگئے ہیں، مجھے ڈر ہے کہ یہ اپنی بہتری کے لیے کچھ زیادہ نہ کر پائیں گے'' اس سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید مسلمانوں کے مزاج کا کس گہرائی سے تجزیہ کر چکے تھے اور اس کی نگاہیں کتنی دوررس تھیں کہ آج بھی نہ صرف برصغیر پاک و ہند کے بلکہ دنیا بھر کے مسلمان مسلسل جھوٹے احساس تفاخر کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ان کے چند ایک مشہور عام مقولے قابل ذکر ہیں۔

''مغرب نے جس شعبے میں جتنی بھی ترقی کی ہے انھوں نے ہم سے ہی لی ہے'' ''ہم اعلیٰ اقدار حیات کے داعی ہیں باقی ساری دنیا باطل ہے'' ''مغرب والوں نے سب اچھی باتیں ہم سے لی ہیں وہ ہماری اقدار کی طرف لوٹ رہے ہیں وغیرہ یہ سب باتیں اس وقت ان حالات میں کہی جارہی ہیں۔ جب یہ دنیا کی ناخواندہ ترین اقوام میں سے ہیں اور سیاسی، اقتصادی، اخلاقی، علمی، عسکری لحاظ سے مغرب کے مکمل طور پر دست نگر، نہ انھیں ترقی اور ارتقاء کے معنوں کی سمجھ ہے اور نہ کوئی احساس زیاں..... کہ اپنا کیا حشر ہو چکا ہے اور دنیا کہاں جا چکی ہے اس لیے سرسید کا بڑا ٹھیک خدشہ تھا کہ مسلمان کبھی اپنی بہتری کے لیے کچھ کر پائیں گے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کو اپنی اور اپنے پچھلوں کی غلطی تسلیم کرنے کی عادت نہیں۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد نقشہ یہ تھا کہ مسلمان ایک ہزار سالہ حکومت کرنے کے بعد اپنی سابق ہندو رعایا کی بہ نسبت سماجی حیثیت، تعلیم اور معاشی خوشحالی میں نہایت خوفناک پستی میں گر چکے تھے۔ ہندستانی مسلمان اب بھی اپنی پستی کو دیکھنے اور اپنے زوال کا تجزیہ کرنے

کی بجائے مسلم شہنشاہیت کے دور کو واپس لے آنے کی خیالی منصوبہ بندی میں مصروف تھے۔ وہ سب کچھ لٹا کر بھی اپنے باغیانہ موڈ کو برقرار رکھنے پر مصر تھے۔ سرسید اس مڈل کلاس کی نمائندگی کر رہے تھے جو انگریزوں کے لائے ہوئے نئے تعلیمی، صنعتی اور تجارتی اثرات میں ابھر رہا تھا۔ مسلمان کا بنیادی مسئلہ یہ ہوا کہ وہ مسلمان حکمران باہر سے آئے وہ بدستور فیوڈل رشتوں میں بندھے رہے اور جن مقامی لوگوں نے مسلم مذہب تبدیل کیا تھا۔ ان کا تعلق نچلے اور سماجی دھارے سے بے دخل طبقات سے تھا۔ ان کے لیے یہی تسلی کافی تھی کہ حکمرانوں کے ہم مذہب ہیں جب کہ ہندو اکثریت نے تجارت، دفتری اور دیگر غیر فوجی پیشوں میں اپنی حیثیت کو برقرار رکھا چنانچہ مسلمانوں میں بورژوا طبقہ پیدا نہ ہو سکا جو انھیں تاریخ کے سیاسی و سماجی سفر میں آگے بڑھاتا۔ سرسید خفیف مسلم پیٹی بورژوا کی بڑی مضبوط آواز بن کر ایک قوم پست کی حیثیت سے ابھرے جنھوں نے دل کی گہرائی سے محسوس کیا کہ مسلمانوں کا ماضی کے ساتھ جذباتی لگاؤ ان کے حال اور مستقبل کے لیے نہایت خطرناک ہے۔ سرسید سماجی اور علمی لحاظ سے جدیدیت (Modernism) کے علمبردار تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے تمام سیاسی او سماجی امراض کا علاج جدید تعلیم میں مضمر ہے۔ 1858ء میں انھوں نے مرادآباد میں خصوصی طور پر جدید تاریخ پڑھانے کے لیے اسکول کھولا لیکن مقامی زبان میں کوئی موزوں کتاب موجود نہ تھی لہٰذا اُن کے ذہن میں ایک ترجمہ کرنے والے ادارے کے قیام کا خیال آیا، چنانچہ انھوں نے SCIENTIFIC SOCIETY OF ALI GARH بنائی۔ وہ ہندوستانی تاریخ میں پہلے مسلمان تھے جنھوں نے تنہا اور بے یار و مددگار ایسی سوسائٹی شروع کی جس کا کام مغربی اقوام کے علم و ادب کو مشرقی لوگوں کی رسائی تک لانا تھا کیونکہ سائنس اور فنون پر ہوا سارا کام ان ایشیائی قوموں کے لیے بند تھا سرسید نے محسوس کیا کہ مسلمان تاریخ کے علم سے محروم ہو چکے ہیں۔ لہٰذا مستقبل کی رہنمائی کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں، انہی بتانا ضروری ہے کہ مغرب کی اقوام کس طرح طاقت ور اور خوش حال بنی ہیں اور ہم زمانے کے ساتھ آگے بڑھنے کی بجائے زوال کا شکار

کیونکر ہو گئے ہیں۔

تعلیم بذریعہ اردو یا انگریزی پر سرسید نے بھی لارڈ میکالے کے نقش قدم پر موقف اختیار کیا۔ انھوں نے کہا ''سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ ہمیں تعلیم کس زبان میں دینی ہے۔ کیا اس زبان میں کافی نصابی کتب موجود ہیں یا نہیں اور اگر نہیں ہیں تو پھر ایسی زبان میں تعلیم دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری بات جو ہمیں پوچھنی چاہیے کیا وہ زبان بذات خود نصابی کتب لکھے جانے کے لیے موزوں بھی ہے یا نہیں اور تیسری بات یہ کہ ایسی زبان میں سائنسی علوم کی تعلیم دینے سے کیا نفس مضمون کی فوری تفہیم' ذہنی ہوشیاری' دماغ کی پختگی اعلیٰ ذہانت' تقریر کی سہولت' ترغیب کی قوت اور وہ کردار پیدا ہو سکتا ہے جس سے ایک شخص کے تعلیم یافتہ ہونے کا ثبوت ملے۔ اردو زبان یہ شرائط پوری نہیں کر سکتی لہٰذا حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیمی نظام کو مکمل طور پر تبدیل کرے اور اس زبان میں تعلیم دینا شروع کرے جس کے ذریعے تعلیم کا حقیقی مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔''

تعلیم کی اہمیت اور مسلمانوں کی خستہ حالت کا ذکر یوں کرتے ہیں۔ ''تعلیم اور طاقت کا رشتہ اس قدر واضح ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اے مسلمانو میں آپ سے کہتا ہوں کہ اپنی حالت پر آنسو بہاؤ کیا آپ کے پاس اتنی دولت (علمی و مادی) ہے کہ آپ ہندو سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ آپ پسماندہ ہیں تجارت آپ کے ہاتھ نہیں' پڑھے لکھے آپ نہیں' آپ آزادی حاصل کیسے کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے پوچھنے کی معافی چاہتا ہوں اور یہ میں زخمی دل سے پوچھ رہا ہوں آپ کی پوری قوم میں سے ایک شخص ایسا نہیں ہے جو کام کی اہلیت کے لحاظ سے ہندو کے برابر ہو۔ فرض کر لیا جائے وائسرائے کی کونسل میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر سیٹیں دے دی جاتی ہیں تو پوری مسلم کمیونٹی میں ایک فرد ایسا نہیں جو ہندو کے مقابلے کا ہو سکتا ہو۔ میں بھی چار سال ممبر رہا ہوں اور اس دوران میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ میں مفلس ترین اور سب سے کم اہلیت کا حامل تھا۔'' افسوس کی بات یہ ہے کہ آج ایک سو سال گزرنے اور آزادی حاصل ہونے کے

بعد بھی ہم تعلیم اور تجارت میں ہندوستان سے پیچھے ہیں۔ آج آزادی حاصل کرنے کا سوال تو نہیں ہے البتہ تعلیم اور مادی ترقی کے بغیر ہم اپنی آزادی کو برقرار کیسے رکھ سکتے ہیں؟ ہندوستان کے اسکولوں کا سلیبس ہمارے اسکولوں کے مقابلے میں کم از کم ایک سال آگے ہے۔ خلیج کی لیبر مارکیٹ میں اپنے ذاتی مشاہدے کے مطابق پاکستانی تعلیم یافتہ نوجوان ہندوستانی تعلیم یافتہ کے مقابلے میں ہر لحاظ سے ادنیٰ حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہم نے انڈیا کو علم اور تجارت کے میدان میں شکست دینے کا کبھی نہیں سوچا لیکن کرکٹ اور میدان جنگ میں اسے شکست دینے کے لیے ہلکان ہوئے جاتے ہیں۔ اول الذکر جعلی قومی احساس تفاخر پیدا کرتا ہے۔ دوسرا ویسے ہی خودکشی کا رستہ ہے بقول سرسید ''صرف ایک ہی چیز آپ کو دنیا میں اعلیٰ مقام عطا کر سکتی ہے وہ ہے اعلیٰ تعلیم جب تک ہم اپنے افراد کو زیور تعلیم سے مزین نہیں کرتے۔ ہم مسلسل پس ماندہ اور خستہ حال رہیں گے اور جس عزت کی ہم خواہش رکھتے ہیں وہ ہمیں کبھی نہیں ملے گی۔'' سرسید کو مسلمانوں سے بے حد محبت تھی لیکن انھوں نے ہندوستان سے کبھی نفرت نہ کی۔ اس میں ہمارے لیے دعوت فکر ہے۔ ہمارے ہاں جتنا زیادہ ہندو نفرت کا ظہار ہو اتنا ہی بڑا محبّ وطن قرار دیا جاتا ہے۔ وطن سے محبت کا اظہار اس کی مسلسل ترقی و خوشحالی کے عمل میں شرکت کر کے ہونا چاہیے۔ سرسید کے زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی کا ماحول لبرل اور سیکولر رکھا گیا' مذہبی شدت پسندی' فرقہ ورانہ تعصب اور عدم رواداری کا کوئی وجود نہ تھا۔

سرسید کی زندگی کا سب سے اہم موڑ ان کا انگلینڈ کا سفر تھا جس نے ایسے ایسے لمحات فکر عطا کیے کہ ان کی فکر و نظر میں انقلاب برپا ہو گیا انھیں مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور تعلیم کے حوالے سے بالکل نئے خیالات بھی میسر آئے۔ انھیں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے حیران کن کارنامے دیکھنے کو ملے اور ان معجزات کو بھی جو صنعتی انقلاب فرانس اور انگلینڈ میں برپا کر رہا تھا۔ ان کی غور و فکر کی عادی نگاہوں نے اعلیٰ تر معیار کی مغربی تہذیب' ثقافت اور یورپی اقوام کی توانائی سے بھرپور زندگی کو خاص طور پر نوٹ کیا۔ اس کے مقابلے میں اسے انھیں مسلمان قوم کا

خیال آیا جو مُردنی میں نہ صرف مست بلکہ خوش رہتی ہے۔ سرسید نے انگلینڈ میں اپنی سرگرمیوں کو مشاہدہ و تحقیق کرنے اور سیکھنے پر مرکوز کر دیا' انھیں وہاں کی اعلیٰ سوسائٹی کو بھی قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بڑے بڑے سر' لارڈ اور عہدے داروں کے ساتھ ڈنر میں شریک ہوئے لیکن وہ ہر بات کو تعلیم کے زاویے سے نوٹ کر رہے تھے انھیں یقین ہو گیا کہ لوگوں کا اخلاقی کریکٹر ہی وہ بنیادی بات ہے جو قوموں کو عظیم بنا دیتی ہے۔ اس کے مقابلے انھیں اپنے لوگوں کی پس ماندہ حالت کا خیال آتا تو اداس اور پریشان ہو جاتے وہ اپنے قیام کے دوران جس خوبصورت تجربے سے گزر رہے تھے انھیں اپنی قوم تک پہنچانے کے لیے بے قرار ہو جاتے۔ سرسید لندن سے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ''میں سچی کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی قومیں خواہ وہ اعلیٰ ذات کی ہوں یا ادنیٰ' سوداگر ہوں یا چھوٹے دکاندار' پڑھے لکھے ہوں یا ناخواندہ جب ان کا مقابلہ انگریز لوگوں کی تعلیم' آداب اور استبازی سے کیا جائے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی غلیظ انسان کو کسی خوبرو انسان کے مقابل رکھ دیا جائے۔'' شاید سرسید اپنی قوم پر تند اور تلخ تبصرہ کر کے اس کے شعور کو جھنجوڑنا چاہتے تھے جو تا حال بے سود ہے جس نے اپنے انداز اور افکار نہیں بدلے۔ ترقی پذیر قوموں کی نفسیات اتنی جلدی بدلنے والی نہیں۔ ذرا دل تھام کر سرسید کی مزید باتیں سنیے۔ ''انگریزوں کے پاس اس یقین کا معقول جواز موجود ہے کہ ہم ہندوستانی نہ صرف جنگلی بلکہ ذہنی معذور بھی ہیں۔ مجھے پتہ ہے مرے ہم وطن میری اس رائے کو نہایت سخت قرار دیں گے اور حیران ہوں گے کہ ان میں کیا کمی ہے!! اور انگریزوں کے پاس وہ کونسی خوبی ہے جس نے مجھے ایسا لکھنے پر مجبور کیا ہے لیکن میں اپنی بات پر قائم ہوں کہ اس پر ان کے حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ یہاں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ یہ ان کے تصوروں سے ہی باہر ہے۔ جو میں دیکھ چکا ہوں اور ہر روز دیکھ رہا ہوں اور اگر یہ پھر بھی میری بات نہ مانیں تو انھیں مچھلی اور مینڈک کی کہانی سناؤ۔ جب ایک مچھلی کسی کنوئیں میں گر گئی تو نیم تاریک کنوئیں کی دیوار کے ساتھ لگ کر اداس اور پریشان ہو کر بیٹھ گئی۔ کنوئیں کے ایک مینڈک نے آ کر پوچھا تم کیوں اداس ہو؟ مچھلی نے جواب دیا میں سمندر کے

بہت ہی کھلے اور روشن پانیوں سے آئی ہوں' اس تنگ و تاریک جگہ میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں وہاں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی لہروں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ مینڈک نے پھدک کر دیوار سے تھوڑا سا دور جا کر مچھلی سے پوچھا' کیا تمہارا سمندر اتنا بڑا ہے..... مچھلی مسکرائی اور کہا' اس سے بہت بڑا' مینڈک نے کنوئیں کا اور تھوڑا سا فاصلہ طے کیا اور پوچھا کیا سمندر اس سے بھی بڑا ہے مچھلی کے ہاں پر مینڈک نے آخر میں تنگ آ کر پورے کنوئیں کا چکر لگایا اور پورے یقین کے ساتھ کہنے لگا تمہارا سمندر اس سے تو بڑا ہر گز نہیں ہوسکتا۔ مچھلی نے کہا نادان تم نے سمندر دیکھا ہی نہیں تم اس کی وسعتوں کا تصور کیسے کر سکتے ہو؟ اس دوران اوپر سے ایک کنکری کنوئیں میں گری تو پانی میں چھوٹی چھوٹی لہریں بن گئیں۔ مینڈک نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا میں نہیں مانتا تمہارے سمندر میں اس سے بڑی لہریں بھی ہوسکتی ہیں!! سرسید یہ کہانی سنا کر آگے بڑھتے ہیں' ''وہ چیزیں جنھیں آپ نے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کے بارے میں آپ کا تصور کرنا ناممکن ہے۔ آپ بغیر دیکھے ان کے بارے میں سوچ نہیں سکتے۔ ہمارے اور انگریز قوم میں فرق بیان کرتے ہوئے میں صرف نرم خوئی' تمیز' علم' صفائی' ہنرمندی' خلوص' کارنامے اور صاف گوئی و دیانت داری کا ذکر کروں گا اور یہ سب تعلیم اور تہذیب کا نتیجہ ہے۔ سب اچھی چیزیں خدا نے یورپ کو اور خاص کر انگلینڈ کو دے دی ہیں حتیٰ کہ اچھی روحانی چیزیں بھی ان کے ہی پاس ہیں' انگریز اپنے مذہب کی ہر خوبصورت اور عمدہ چیز پر عمل کرتے ہیں جس کا کسی دوسری قوم سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا اس لیے ہے کہ ان کے مرد و زن سب پڑھے لکھے ہیں اور ساری قوم عمدگی اور خوبصورتی کی جستجو میں متحد ہے۔ اگر ہندوستانی بھی تہذیب کو حاصل کر لیں تو وہ بھی ان کے برابر ہو سکتے ہیں۔ ہندوستانیوں کو چاہیے کہ سب مغربی علم کا اپنی زبان میں ترجمہ کر لیں ورنہ وہ کبھی بھی مہذب نہ بن سکیں گے۔'' سرسید ترقی یافتہ قوموں کے آگے نکل جانے کی کیسی رگ پکڑتے ہیں کہ ساری قوم عمدگی اور خوبصورتی کی جستجو میں متحد ہے! مغربی لوگوں کا نجی رہن سہن ہو یا کوئی عمل..... وہ اسے عمدگی اور حسن کی معراج پر پہنچا دیتے ہیں۔ ہمارا ہر کام بے ڈھنگا' بے ترتیب' ادھورا' بھدا اور گھٹیا کوالٹی کا ہوتا ہے اس لیے

وہ سستا ہوتا ہے۔ترقی یافتہ قوموں اور ہم پس ماندہ قوموں میں بڑا امتیازی فرق ہمارا حس جمال ختم ہونا ہے۔ ورنہ ہم اپنے ماحول' سماج' ملک اور زندگی کو خوبصورت بنانے کے بارے میں ضرور سوچیں۔ہم صدیوں سے غیر نفیس ماحول میں رہ رہے ہیں۔ہمیں خوبصورتی کا پتہ نہیں۔لہٰذا وہ ہماری منزل بھی نہیں۔سرسید سوال اٹھاتا ہے۔''ہمارے ہاں کون ہے جو علم کے حصول کی خاطر پڑھتا ہے۔سب نوکری کی خاطر پڑھتے ہیں لیکن جب کوئی قوم تہذیب حاصل کر لیتی ہے' وہ سرکاری نوکری کی پرواہ نہیں کرتی۔علم کے بل بوتے پر کسی بھی کام پر نکل پڑتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے ہاں بھی وہ دن جلد آئے گا۔''(ڈیڑھ سو سال میں ابھی تک نہیں آیا!)

لندن میں سرسید جس گھر میں ٹھہرتے ہیں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں''میرے مالک مکان کا نام MR.J.LUDLAM ہے وہ اور اس کی بیوی دونوں تعلیم یافتہ' لائق اور باعزت لوگ ہیں۔ وہ ہر روز شام کو کبھی کیمسٹری' کبھی ماحولیات اور کبھی علم حیوانات پر لیکچر سننے جاتے ہیں' یہ اور اس طرح کے دوسرے لیکچر لوگ خود منظّم کرتے ہیں۔ ان کے لیے ہر شخص کچھ پیسے (Penny) ادا کرتا ہے۔اس سے اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ جگہ کا کرایہ اور لیکچرار کا معاوضہ نکل آتا ہے۔''اس سے سرسید ہمیں اس قوم کی علم دوستی' خود تنظیمی کے علاوہ بتا رہے ہیں کہ کوئی چیز مفت نہیں ہوتی۔ جب کہ ہم پس ماندہ اقوام کی نفسیات ہوتی ہے کہ ہر کام مفت میں اور بغیر کوشش کے ہو جائے۔سرسید مزید لکھتے ہیں''میں چاہتا ہوں' اپنی قوم کو بتاؤں کہ ان لوگوں کا عمومی علم جس قدر زیادہ ہے جن کے پاس میں اس وقت رہ رہا ہوں۔مسز لڈم بھی بڑی قابل' تعلیم یافتہ' ہنرمند اور دیگر بڑی خوبیوں کی مالک عورت ہے۔ بڑی لیاقت کے ساتھ گھر کا سارا کام خود کرتی ہے۔ اس کی ایک بہن کتابیں پڑھنے کی بڑی شوقین ہے میں اس وقت رسول پاکؐ کی حیات طیبہ پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ چنانچہ میں نے اس موقع پر انگریزی میں چھپی بہت سی موافق اور مخالف کتابیں اکٹھی کر رکھیں ہیں' مس ایلن ایک دفعہ بیمار ہو گئی۔ وہ کمزور تھی اور بستر سے نہیں اٹھ سکتی تھی۔اس نے مجھے پیغام بھیجا کہ میں اسے کچھ کتابیں بھیجوں تا کہ اس کے علم میں اضافہ ہو سکے۔

میں نے اسے جواب دیا کہ میرے پاس مذہبی کتابیں ہیں جو متنازعہ قسم کی ہیں لیکن اس کے برابر اصرار پر میں نے اسے ایک کتاب دے دی۔ دو دن بعد صحت یاب ہونے پر وہ میرے پاس آئی اور کتاب پر اپنی نہایت عمدہ رائے کا اظہار کیا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں کی نچلے درمیانہ طبقے کی عورت کا تعلیمی معیار کتنا بلند ہے۔ کیا یہ حیرانگی کی بات نہیں کہ ایک عورت اور وہ بھی بیماری کے دوران اپنا علم اور ذہنی استعداد بڑھانے کے لیے مطالعہ کو نہایت ضروری سمجھتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی ہندوستان میں ایسا رواج کسی راجے مہاراجے کے خاندان میں یا کسی اعلیٰ خاندان کے کسی فرد میں دیکھا ہو؟ لیکن یہاں کے لوگ اتنے حیران ہوتے ہیں' جب میں انھیں بتاتا ہوں کہ ہندوستانی عورت نہ لکھ سکتی ہے' نہ پڑھ سکتی ہے۔ وہ تعلیم و تدریس سے بالکل بے خبر ہے۔ اس پر وہ صرف حیران ہی نہیں ہوتے۔ ناخوش بھی ہوتے ہیں اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ انگریز لوگ ہندوستان میں اپنی پالیسی کی وجہ سے ہم سے مل جل جاتے ہیں اور اچھا سلوک کرتے ہیں۔ ورنہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان طرز زندگی' رسم و رواج اور ذاتی زندگیوں میں اتنا فرق ہونے کے باعث اگر ان دو قوموں کے افراد کسی آزاد ملک میں ملیں تو انگریز ہم سے کبھی بات کرنا بھی گوارا نہ کریں.....ہم کو جانوروں کے برابر سمجھیں'' سرسید مزید اپنی قوم کا انگریز قوم کا مقابلہ یوں کرتے ہیں'' ''Bristol کے نزدیک کلفٹن پر اگر کھل جانے والے فولادی پل کو دیکھو تو تم انسان کے علم کی طاقت کے احساسات سے مغلوب ہو جاؤ گے' خاص طور پر تمہارا دل اس قوم کی عظمت و شان کے احترام میں لبریز ہو جائے گا جس کے کریڈٹ میں اتنا حیران کن کارنامہ موجود ہے اور جب انسان یہ سوچتا ہے کہ یہ کارنامہ بادشاہوں کی طاقت کے بس کا نہیں تھا بلکہ یہ خود عوام کی اپنی شراکت' فیاضی' عزم و ہمت اور اعلیٰ تر شعور کا نتیجہ ہے تو اس قوم کے بارے میں احترام اور بھی بڑھ جاتا ہے اور جب تم سوچتے ہو کہ یہ عظیم الشان پل صرف عوام کی بھلائی کے لیے بنایا گیا تھا.....کسی بادشاہ کا قلعہ یا مزار نہیں تھا یا کسی راجہ کی تفریح گاہ نہیں تو خود پر عظیم تاثر طاری ہو جاتا ہے خاص طور پر جب آپ خود ایک بدقسمت قوم کے فرد ہوں' جو خود غرضی'

حسد، فضول خرچی، بدعنوانی اور اپنے عقائد پر اندھا دھند ایمان رکھنے میں کوئی نظیر نہ رکھتی ہو۔''
سرسید بتا رہے ہیں کہ قوموں کی عزت ان کے عمل اور کارناموں کے حوالے سے ہوتی ہے۔ ہوائی باتوں یا جعلی یا مصنوعی احساس تفخر سے نہیں.....جیسا کہ ہمارا شیوہ ہے.....ہم کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیتے.....نعروں، ترانوں اور قومی نغموں کے خالی ڈھول بجانے والی قوم ہیں.....نہ احساس زیاں.....نہ کچھ کر گزرنے کا عزم.....ایسی قوم کے ساتھ وابستگی کو سرسید بدقسمتی سے تعبیر کرتے ہیں.....خاص طور پر ایسا احساس اس وقت شدت اختیار کر لیتا ہے جب انسان کسی زندہ و سرفراز قوم کو قریب سے دیکھتا ہے چنانچہ سرسید کے مزید تاثرات ملاحظہ فرمائیے''میں جتنا زیادہ یہاں کی زندگی کو دیکھ رہا ہوں۔ اتنا ہی میں اپنی قوم کے پاگلانہ تعصّبات، حماقتوں، ان کی موجودہ تنزلی اور مستقبل کے مزید زوال کے بارے میں سوچ کر اور اداس ہو جاتا ہوں اور مجھے کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی کہ میں انھیں خبردار کروں۔ ان تباہیوں کے بارے جن کا انھیں سامنا ہے حتیٰ کہ وہ مذہب میں بھی اسی طرح کی حماقتوں اور جہالت کا مظاہرہ کرتے ہیں جیسے کہ زندگی کے دوسرے معاملات میں حالانکہ ان کا خیال ہے کہ وہ اس پر بڑے اچھے طریقے سے ایمان لائے ہوئے ہیں۔''

سرسید کا سفر لندن اپنی قوم کی بے حسی کے ایک اور پہلو کو اجاگر کرتا ہوا اختتام پذیر ہوتا ہے جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے سرسید دراصل حضرت محمدؐ کی حیات طیبہ پر ایک تحقیقی کتاب لکھنے لندن گئے تھے۔ کتاب تیار ہوئی، اشاعت پر 2500 روپے لاگت آتی ہے۔ (تاریخ اشاعت جنوری 1870ء) کتاب کی اشاعت پر سرسید اپنی ساری متاع خرچ کر دیتے ہیں ان کا خیال تھا کہ کتاب کی جرمن اور فرانس میں اچھی فروخت ہو جائے گی لیکن اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا جب اس دوران دونوں ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے۔ سرسید شدید مالی مشکلات میں پھنس جاتے ہیں اور ایک ایک پیسے کو ترس جانے کی نوبت آ جاتی ہے۔ اوپر سے انھیں اپنے ہم وطن مسلمانوں کی طرف سے زبانی تحسین کی بھی کوئی امید نہ تھی۔ سرسید بڑی اداسی سے لکھتے ہیں، ''میرے ہم وطن (مسلمان) ہرگز نہ سرائیں گے میری اس محنت شاقہ کو جو میں نے اس کام پر

لگائی ہے بلکہ اس کے برعکس وہ میری مذمت کریں گے اور مجھے کافر اور منحرف دین قرار دیں گے کیونکہ میں آنکھیں بند کر کے عقائد کی پیروی کرنے والا نہیں رہا..... میں نے چند منتخب علماء کے عمومی خیالات سے اختلاف کیا ہے لہٰذا یہ میرے مہربان مسلم دوست میری ہر دوسری (صفت) چیز کو بھول جائیں گے اور محض چند مولویوں سے اختلاف کرنے پر مجھ پر کفر کے فتوے صادر کر دیے جائیں گے۔'' چنانچہ حسب توقع قوم نے سرسید کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو اس نے ہمیشہ ہر عقل کی راہ دکھانے والے کے ساتھ کیا ہے۔!

سرسید لندن سے واپس آ کر ایک تعلیم پسند، سماجی مصلح، جدیدیت اور مسلم رینے سانس کے علمبردار کے طور پر سرگرم ہوتے ہیں۔ انگلینڈ کے سفر کے دوران انھوں نے گوروں کی شہرہ آفاق کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کا بھی دورہ کیا اور ان کے نظام تعلیم کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اس نے انھیں خطوط پر چلنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا مقصد تھا کہ اعلیٰ ترین تعلیمی سہولت مہیا کی جائے تا کہ وہاں سے قابل اسکالر پیدا ہو سکیں۔ اب راتوں رات یونیورسٹی بنانا تو ممکن نہ تھا۔ درجہ بدرجہ ہی آگے بڑھا جا سکتا تھا۔ سرسید سرکاری ملازم تھے کوئی امیر آدمی نہیں تھے۔ انگلینڈ کا سفر بھی انھوں نے اپنے بنگلے کو گروی رکھ کر کیا تھا۔ لہٰذا اتنے بڑے پراجیکٹ کی منصوبہ بندی اور سرمائے کا حصول بہت بڑا کام تھا۔ وہ خیالی پلاؤ پکانے والے شخص نہ تھے، ایک مکمل طور پر عملی شخص جس کے پاس بھرپور انرجی اور حوصلہ نہ چھوڑنے والی قوت ارادی موجود تھی۔ انگلینڈ جانے سے پہلے ہی وہ ''مسلم یونیورسٹی'' کے نام سے ایک فنڈ کمیٹی رجسٹرڈ کروا گئے تھے۔ 1873ء میں یونیورسٹی کے نام سے علی گڑھ میں رجسٹر کرنے کی درخواست دے دی۔ سرسید نے فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے ملک کے طول و عرض کا دورہ شروع کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کو مشترکہ مقصد کی خاطر متحرک کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ علماء کی طرف سے نہایت شرمناک کردار کشی کی مہم شروع کر دی گئی تھی۔ انھوں نے مکے کے علماء سے یہ فتویٰ حاصل کر لیا تھا کہ ''اس سلسلے میں سرسید کی کوئی مادی و اخلاقی مدد نہ کی جائے، خدا سے دعا کی جائے کہ وہ اس ادارے اور اس کے

بانی کو غارت کرے۔ ہر ایمان والے کا فرض ہے کہ اگر یہ ادارہ قائم ہو جائے تو وہ اسے تباہ کر دے اور جو لوگ اس کے ہمدرد ہیں ان کی لعنت ملامت کی جائے اور انھیں مارا پیٹا جائے'' اسلام کے مراکز مکے و مدینے پر صدیوں سے کس قبیل کے ''علماء'' کا قبضہ ہے۔ وہ اس فتویٰ سے واضح ہے۔ صورت حال آج بھی ویسی ہے۔ دنیا بھر میں رجعت پسند اور ترقی کی دشمن قوتوں کی مادی مدد اور حمایت کرنا ''محافظ حرمین شریفین'' (مسلم پاپائیت) اور وہاں کی ریاست کا فرض اولیں ہے تا کہ مسلمانوں کے اندر روشنی اور ترقی کبھی نہ آنے پائے۔ بہر حال سرسید ڈٹے ہے اور اس نے ہار نہ مانی.....ادھر اس نیک اور عظیم کام کی خاطر خوش حال غیر مسلم بھی ذاتی عطیے دے رہے تھے۔

وائسرائے ہند اور گورنر جنرل لارڈ LYTLON نے کالج کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے کہا'' حکومت مسلمانوں کی سماجی ترقی کے اس منصوبے کے لیے ہر طرح کی امداد فراہم کرے گی'' اس نے یاد دلایا'' جب یورپ کی عیسائی قومیں اپنی تاریکی اور سماجی بربریت سے ابھی نکل ہی رہی تھیں تب مسلم دنیا طب' فلسفے اور ریاضیات کے ایسے سکولوں سے بھری تھی جو اپنے وقت میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ آج اسپین اور پرتگال کی آبادی اس وقت کے انجنیئر وں کی مرہون منت ہے لیکن خدا نے سماجی اور انسانی فکر کی ترقی کے لیے کسی ایک قوم کو مخصوص نہیں کیا۔ مغرب کی آج جدید ثقافت اس پوزیشن میں ہے کہ وہ مشرق کی اس ابتدائی دانش کا قرض چکا سکے۔ یہ مغربی خیالات کی سرگرمی اور مغربی علوم کا اطلاق ہے کہ ہم ہندوستان کی سماجی اور سیاسی ترقی کی طرف اب دیکھ رہے ہیں' میں ہندوستانی مسلمانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ علم کے نئے میدانوں کو تلاش اور انھیں فتح کریں' اور کارنامے نمایاں انجام دینے کے تازہ مواقعوں کو پکڑیں۔ جینٹلمین میں آپ کو اس بدھ مت کے پیشوا (Monk) '' کی بات یاد کرواتا ہوں۔ جب چھاپا خانہ پہلی دفعہ ایجاد ہوا تو اس نے پیش گوئی کہ اگر اس خطرناک ایجاد کو فوری طور پر نہ دبایا گیا تو یہ مشین جلد ہی دنیا کی ہر حکومت کے اقتدار کا خاتمہ کر دے گی کیونکہ دھاتی حروف (ٹائپ) بنانے کے لیے اتنا سکہ (Lead) استعمال ہوگا کہ حکومتوں کے پاس اپنی گولیاں بنانے کے لیے سکہ ہی

نہیں بچے گا'' لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں یہ پیش گوئی صحیح ثابت نہیں ہوئی..... بلکہ برطانیہ حکومت یہ سمجھتی ہے کہ پرنٹنگ پریس کی طاقت توپ کی طاقت سے کسی طور کم نہیں..... چنانچہ میں کالج کے قیام کا خیر مقدم کرتا ہوں' ہم چاہتے ہیں کہ اعلیٰ سے اعلیٰ اوادنیٰ سے ادنیٰ شہری بھی تعلیم یافتہ ہوتا کہ وہ حکومت برطانیہ کے اصولوں کو جان سکے۔''

اس سے پہلے سرسید اپنی تقریر میں وائسرائے سے کہہ چکے تھے کہ حکومت از خود بھی تعلیم کو عام کرنے کی خاطر اقدامات کرے اس کے جواب میں دیکھیے وائسرائے کتنی خوبصورت اور پتے کی بات کرتا ہے'' آپ نے حکومت کی رضا کارانہ کوششوں کو بڑھانے کی طرف جو اشارہ کیا ہے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ معاملہ تعلیم کا ہو یا کسی اور چیز کا.....حکومت اسے مصنوعی طور پر مہیا کرنے کی ذمہ داری نہیں لے سکتی جب تک اس کے لیے عوام کی طرف سے کوئی مطالبہ نہ ہو.....'' یعنی وہ بتا گیا کہ حقوق کوشش کرنے اور مانگنے سے ملتے ہیں اور پھر اس سے بھی بڑی بات حقوق کا شعور ہونا ہے.....اس سے یہ بھی عندیہ ملتا ہے کہ کچھ بھی پانے کے لیے اپنی کوشش بنیادی شرط ہے..... جب کہ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ پہلے تو شعور ہی نہیں ہے دوسرے محنت اور کوشش کر کے حاصل کرنے کی عادت بھی نہیں یہ وجہ ہے کہ ہمارا دانش ور طبقہ اپنے قومی مسائل کا تجزیہ کرنے بیٹھتا ہے.....وہ فوراً امریکہ پر پہنچ جاتا ہے.....اور اسے اپنی تمام تر بیماریوں کا ذمہ دار قرار دے کر برا بھلا کہنا شروع کر دیتا ہے.....اسے اپنی قوم اور سیاسی قیادت کی کوئی کوتاہی یا خطا نظر نہیں آتی اور نہ ہی وہ کوئی ایسے اقدامات تجویز کر پاتا ہے کہ آخر میں خود بھی تو کچھ کرنا چاہیے.....نہیں امریکہ نے برباد کیا ہے وہ ہی ہماری اصلاح اور بچاؤ کرے.....خدایا تو اسے غارت کر دے یا اسے فرشتہ بنا دے.....ہم خود کچھ نہیں کریں گے.....لیکن وائسرائے غلام قوم سے یہ کہہ رہا ہے' خود بھی تو کوئی ہوش سنبھالو.....خود کو آزاد کرانے کی اپنی بھی تو کوئی تدبیر کرو.....لیکن ہم اگر خود کو آزاد کرانے کی تدبیر کریں گے بھی.....تو تعلیمی' اقتصادی اور صنعتی انقلاب برپا کرنے کی بجائے چوری چھپے ایٹم بم بنانا شروع کر دیں گے.....یعنی مزید ایک اور طرح کی تباہی کے دائرے میں

جاگھسیں گے..... ادھر ہم دیکھتے ہیں۔ آقا بھی اگر تعلیم یافتہ ہو تو کتنی خوبصورت باتیں کرتا ہے..... وائسرائے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے'' لائبریری بہترین سوسائٹی ہوتی ہے جس میں کوئی انسان جاسکتا ہے۔اس لیے کہ وہاں (کتابوں کی شکل میں) دنیا کے عظیم ترین محسنوں کا اجتماع ہوتا ہے۔سارے زمانوں کی نیکی اور دانائی وہاں موجود ہوتی ہے۔لائبریری میں وہ لوگ زندہ رہتے ہیں جو زندہ رہنے کے قابل ہوتے ہیں اور میرے لیے بڑی اعزاز کی بات ہے کہ میں ایک ایسی عمارت کا سنگ بنیاد رکھ رہا ہوں۔جس کی چھت تلے ایسے اعلیٰ وارفع کاموں کا اضافہ ہوگا اور ایسا کرتے ہوئے میں آپ اور آپ کے ساتھیوں اور آپ کے ارفع مقاصد کے لیے دعائے خیر کرتا ہوں۔'' کالج کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا لیکن مشکلات ابھی آگے تھیں' سرسید کو ان شکوک وشبہات اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے بہت کوشش کرنی پڑی جو قدامت پرست اور رجعتی ملاؤں نے لوگوں کے دلوں میں ڈال دی تھیں۔سرسید نے لوگوں کو سمجھایا کہ کالج میں مذہبی کتابیں بھی پڑھائی جائیں گی۔جو ہندوستان کے سب مسلمانوں کے لیے یکساں طور پر قابل قبول ہوں گی لیکن مذہبی تعلیم جو دی جائے گی وہ بہتر شکل وصورت (روشن خیالی پر مبنی) کی ہوگی' جو اس سے پہلے کسی اسلامی مدرسے میں نہیں دی گئی۔ہم اس کے خلاف نہیں جو ان مذہبی مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ہماری شکایت تو صرف یہ ہے کہ ان مدرسوں میں مذہبی مضامین کے ساتھ بہت سی ایسی چیزیں بھی پڑھادی جاتی ہیں جو مکمل طور پر فضول اور بے فائدہ ہوتی ہیں۔ان مدرسوں کے فارغ التحصیل طلباء مادی اور روحانی لحاظ سے کسی کام کے نہیں ہوتے وہ صرف مسجدوں میں خیرات پر زندگی گزار دیتے ہیں۔محمڈن کالج کسی خاص فرقے کے لیے نہیں بنایا گیا نہ ہی معاشرے سے الگ تھلگ زندگی گزارنے والے اسکالروں کے لیے ہے بلکہ اسے عام مسلمانوں کے لیے بنایا گیا ہے۔جنھیں روزی کمانی ہے۔گورنمنٹ سروس میں جانا ہے۔دنیا میں کچھ حاصل کرنا ہے' اعلیٰ عہدوں پر پہنچنا ہے اور یہ انگریزی زبان اور جدید علوم وفنون کے بغیر ممکن نہیں۔وہ لوگ جو منطق' فلاسفی اور فزکس کو ممنوعہ چیز نہیں سمجھتے وہ یہاں آکر پڑھ سکتے ہیں اور جو

ان مضامین کو خلاف مذہب سمجھتے ہیں ان کیلیے الگ مدرسہ کھولا جا سکتا ہے۔ جہاں تک اس افواہ کا تعلق ہے کہ یہاں پر طلباء کو یورپی طرز معاشرت سکھائی جائے گی۔ میرا ذاتی نظریہ ہے اور میں اسے شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ مسلم نوجوانوں کو اسباق پڑھانے سے زیادہ ان کی تربیت کی ضرورت ہے۔ ان کے اندر سے سستی کی عادت ختم کرنی ہے۔ انھیں صاف ستھرا رہنا سیکھانا ہے۔ ان کے طرز لباس کو درست کرنا ہے اور ان کے معاشرتی آداب کی اصلاح کرنی ہے۔ اور یہ سب کچھ نہایت ضروری ہے تا کہ ترقی یافتہ ہونے کے لیے جن خصلتوں کی ضرورت ہے وہ ہم میں پیدا ہو سکیں۔'' سرسید کا رویہ ہمیشہ جمہوری رہا۔ وہ اپنی بات ٹھونستے نہیں تھے' دلیل سے سمجھاتے تھے حتیٰ کہ کالج کی پالیسیاں وضع کرنے میں کمیٹی کے ارکان کی اکثریت کا اتفاق ضروری تھا' چنانچہ ایک جگہ سرسید کہتے ہیں'' میں اپنے نظریات کی سچائی اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ مبنی بر عقل ہیں۔ اپنی پوری طاقت اظہار استعمال کر دوں گا۔ اگر کمیٹی کے دوسرے ممبران نے میری بات پر اتفاق کیا تو میں سمجھوں گا مسلمانوں کے برے دن ختم ہو گئے۔ اور ان پر اچھے دنوں کی صبح طلوع ہو گئی۔ اگر اس کے برعکس میرا نقطہ نظر تسلیم نہ کیا گیا تو میں اس نتیجے پر پہنچوں گا کہ مسلمانوں کی بدقسمتی ابھی تک ان کے سروں پر لٹک رہی ہے۔''

کالج کے طلبا کی یونیفارم میں انگریزی بوٹ اور جرابیں پہننا لازمی قرار دیا گیا تو مخالفوں نے پروپیگنڈا کیا کہ طلباء کو عیسائی بنایا جا رہا ہے۔ طلباء کو میز پر کھانا دیا گیا تو مذاق اڑایا گیا کہ طلباء چھری اور کانٹے سے کھانا کھائیں گے۔ ان حالات میں کالج نے پہلی جنوری 1878ء کو کلاسیں شروع کیں۔ رفتہ رفتہ ڈگری کورس بھی شروع کیے گئے' مخالفت میں نرمی آنے لگی اور کٹر مخالفوں نے بھی اپنے بچے بھیجنے شروع کر دیے! پورے ہندوستان میں وہ اعلیٰ اور معیاری تعلیم کی مثال بن گیا لیکن سرسید مطمئن نہ تھے..... ان کا خواب تھا'' ہم نے باغ میں جو پودا لگایا ہے اب اس میں سے ایک ایسا طاقت ور درخت اگے گا جس سے نئی قوتیں پیدا ہوں گی' یہ کالج ایک یونیورسٹی میں تبدیل ہو جائے گا اور یہاں پر ملک کے کونے کونے سے طلباء آ کر کھلے ذہنوں کے

ساتھ آزادانہ تحقیق کریں گے اور ترقی یافتہ کریکٹر تعمیر ہوں گے۔''

لیکن پاکستان کی تعلیمی حالت زار اور سرکار کی تعلیمی لاپرواہی کو دیکھ کر یقیناً سرسید کی روح آج بھی تڑپ رہی ہوگی۔ ان کے خوابوں کا تقاضا تھا کہ پاکستان کے تمام چھوٹے بڑے شہر معیاری تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں سے بھرے ہوتے۔ پاکستانی معاشرہ روشن خیال، ترقی پسند اور لبرل نظریات کا حامل ہوتا..... جہاں ترقی اور تحقیق کی راہ میں کوئی معاشرتی، ثقافتی اور عقیدے کی رکاوٹ نہ ہوتی.....لیکن آج کا پاکستان ناخواندگی، اخلاقی گراوٹ، مذہبی تنگ نظری، فکری و مادی جمود کی منہ بولتی تصویر بنا ہوا ہے۔ سرسید نے بجا طور پر مسلم قوم کی بربادی کے دو واضح اسباب ڈھونڈے تھے۔ ایک تعلیم سے بیگانگی اور دوسرے مسلمانوں کے مروجہ مذہبی عقائد.....جو ان کی فکری، ثقافتی اور سماجی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ایک سیکولر اور سائنسی نظام تعلیم ہی ہمیں ترقی کی راہ پر ڈال سکتا ہے۔ سرسید نے بڑے خلوص کے ساتھ مسلمانوں کے مذہبی عقائد بھی ''درست'' کرنے اور انھیں سائنسی اور روشن خیالی کے قالب میں ڈالنے کی کوشش کی جسے مسلمانوں نے درخور اعتنا نہ سمجھا.....1400 سال کا فکری زنگ جو ان کے ایمان کا حصہ بن چکا ہے ظاہر ہے وہ اب نہیں اتر سکتا البتہ انھیں ترقی اور تعلیم کی راہ پر ڈال کر ضرور تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

❖.....❖.....❖

تاریخ اسلام میں تعلیم اور رٹے کی روایت

کیا علم سے بیر مسلم مزاج کا حصہ ہے؟

اسلام کی ثقافتی تاریخ، عقیدے اور عقل کے درمیان تصادم کی داستان ہے۔ تعلیم کا لفظ علم سے ماخوذ ہے اور علم بنیادی طور پر عقل سے مشروط، چنانچہ عقل، علم اور تعلیم مسلم معاشروں میں کمزور ترین عناصر کے طور پر پائے جاتے ہیں۔ عقیدے کی حفاظت اس قدر پر جوش رہی کہ اس کے عوض کیا کیا کھویا جا سکتا ہے۔ اس کا ہمیں ہوش ہی نہ رہا اسی چیلنج کا سامنا مغربی اقوام کو بھی کرنا پڑا تھا..... ایمان اور عقل کی لڑائی یورپی تاریخ میں ہم سے زیادہ متشدد رہی ہے لیکن ہم اس کے بھی بڑے غلط نتائج نکالتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ چونکہ عیسائی عقیدہ زیادہ خرد دشمن تھا لہٰذا وہاں مذہبی اور عقلی قوتوں کے درمیان لڑائی بھی زیادہ شدید رہی..... جب کہ ہمارا عقیدہ عقل کے معاملے میں نرم گوشہ رکھتا ہے بلکہ ''عقل اور فطرت'' کے عین مطابق ہے لہٰذا مغربی دنیا کی طرح عقل اور عقائد کے درمیان شدید ٹکراؤ مسلم تاریخ میں نظر نہیں آتا لیکن اس کی یہ وجہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ ہمارے ہاں عقل عقیدے سے مغلوب ہو گئی۔..... اور ہم نے مڑ کر کبھی عقل کی طرف دیکھا ہی نہیں.....! مغربی دنیا میں مسئلہ عیسائی عقیدے کا کٹر پن نہ تھا بلکہ ان کی Uncompromised خرد پسندی تھی جو عقیدے کو اپنی فہم و نظر پر طاری کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ لہٰذا ثقافتی و مادی ارتقا بھی انھیں کے حصے میں چلا گیا۔

ہمارے ہاں تعلیم کی اہمیت کا سوال جب آتا ہے تو اس کے ''ثبوت'' میں احادیث اور آیات پیش ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ سمجھ نہیں آتی کہ کیا تعلیم ہمیں اس لیے حاصل کرنی چاہیے کہ اس کی تاکید ہماری مذہبی روایات میں موجود ہے؟ کیا ترقی یافتہ قوموں نے تعلیم حاصل نہیں کی؟ اس حقیقت کے باوجود کہ ان کے مذہب میں اس طرح کا مواد نہیں..... دراصل زندگی کے ہر پہلو کو تقدیسی پیمانوں سے ناپنا..... ایک غیر سنجیدہ حرکت اور سراسر غیر سائنسی فعل ہے۔ سوال یہ ہے کہ تعلیم ہماری سماجی اور تہذیبی ارتقاء کا اٹوٹ حصہ کیوں نہ بن سکی۔ تعلیم اقوام اور افراد کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے جس کے لیے مقدس اقوال کی ضرورت نہیں۔ ایک طرف ہم احادیث رسولؐ اور قرآنی آیات سناتے ہیں جب کہ مسلم اقوام اس کے برعکس زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اس کا مطلب ہوا مقدس کتب میں جو کچھ ہے وہ اپنی جگہ لیکن ہمارے لیے تو اس نفسیاتی' تاریخی اور سماجی عمل کو سمجھنا زیادہ ضروری ہے جس کی وجہ سے ہم علم سے گریز کرتے رہے ہیں۔

اسلام کا ابتدائی زمانہ یونیورسل ناخواندگی کا دور تھا۔ ان لوگوں کی تعداد نہایت قلیل تھی جنھیں خواندہ کہا جا سکتا ہو' چنانچہ تحریر اور خواندگی (Reading) کی عدم موجودگی میں زبانی (Oral) روایت کا سسٹم رائج تھا۔ وحی اول کے ابتدائی الفاظ میں بھی منہ زبانی پڑھنے کا ذکر ہے ان کو کسی تدریس و تعلیم کے نظام کا حوالہ بنانا صحیح نہیں..... قدیم عربوں کی ادبی تاریخ میں قرآن پاک کا نزول ایک اہم واقعہ ہے لیکن یہ بات قابل غور اور حیران کن ہے کہ آپؐ کی اپنی زندگی میں وحی' خداوندی کے متن کو کتابی شکل میں مجتمع کرنے کی کوشش نہیں کی گئی..... کلام پاک ٹکڑوں میں زبانی وارد ہوتا رہا اور سامعین میں سے کچھ صحابہؓ از خود ان کلمات کو زبانی یاد کرنے لگے جو لکھ سکتے تھے وہ قدیم حروف میں کھجور کے پتوں' کھالوں یا خشک ہڈیوں پر تحریری نشان کھینچ دیتے۔ آپؐ کی وفات کے بعد جب سرحدی حملوں اور خانہ جنگیوں میں وہ لوگ ختم ہونے لگے جو وحی کے حصوں کو زبانی یاد کیے ہوئے تھے تب کلام خدوندی کی حفاظت کا خیال پیدا ہوا۔ حضرت عمرؓ کے مجبور کرنے پر خلیفہء اول نے زیدؓ بن حارث کو اس کام کی ذمہ داری سونپ دی۔ چنانچہ اعلان عام کے ذریعے

قرآن پاک کے حصے طلب کیے گئے اور ان کی تصدیق کے لیے دو افراد کی گواہی کی شرط رکھ دی گئی۔ زیدؓ نے سہولت کی خاطر زمانی تسلسل کی بجائے ابواب کو ان کی لمبائی کے حساب سے ترتیب دے دیا۔ پہلے لمبی اور آخر میں چھوٹی سورتیں رکھ دیں' حضرت عمر فاروقؓ جب ریاست کے سربراہ بنے تو انھوں نے زیدؓ کا ترتیب کردہ مسودہ فائنل قرار دے دیا' اس لیے کہ وہ ایڈیشن ان کی نگرانی میں تیار ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد قرآن پاک کا یہ پہلا ایڈیشن ان کی بیٹی حفصہ کو ورثے میں ملا۔ آرمینیا اور آذربائیجان کی جنگوں میں عراقی اور شامی سپاہیوں کے درمیان اس بات پر جھگڑا ہو گیا کہ قرآن پاک کو کس طریقے سے پڑھنا چاہیے چنانچہ خلیفہ وقت حضرت عثمانؓ نے ایک بار پھر مستند متن تیار کرنے کا حکم دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی تیار کردہ تمام کاپیاں واپس لے لی گئیں سوائے اس کاپی کے جو بنت عمر حفصہؓ کے پاس تھی لیکن اس نسخے کو بھی کچھ ہی دیر بعد مدینے کے گورنر نے تلف کر دیا چنانچہ آج دنیا بھر میں کلام اللہ کی جتنی بھی کاپیاں ہیں وہ عثمانیہ ایڈیشن ہی کہلاتی ہیں۔

مذکورہ بالا تاریخی حقائق بتانے کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں قرآن پاک کی ترتیب' تالیف اور طباعت کو مکمل ہونے میں کتنے ارتقائی مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ وہاں عام خواندگی کا تصور یا کسی نظام تعلیم کا وجود تو بڑی ہی دور کی بات تھی۔

اسلام کے کلاسیکل دور میں دو باتیں بڑی واضح نظر آتی ہیں۔ نمبر ایک نظام تعلیم اور اس کا فلسفہ ناپید تھا۔ ان کی ساری علمی اور فکری تگ و دو اپنی مذہبی کتاب کے متن تک ہی مرکوز تھی۔ تبلیغ اسلام کو ''تعلیم'' اور حافظ قرآن کو ''طالب علم'' سمجھا جاتا تھا چنانچہ وہ کائنات اور فطرت کے علم سے زیادہ واقف نہ تھے۔ نمبر دو ان کی زندگی میں جہاد یعنی اپنے سیاسی اثر و روسوخ کو پھیلانے کا عنصر غالب تھا۔ ابتدائے اسلام کے زمانے کے لوگ فکری طور پر سادہ لوح تھے۔ مکے اور مدینے میں کبھی فلسفہ و منطق کی روایت موجود نہیں رہی۔ قدیم عربوں کا فکری اثاثہ صرف محاوروں' اقوال اور کہاوتوں پر مشتمل تھا' قرآن پاک میں بھی ایک ہی دانا شخص حکیم لقمان کا ذکر ملتا ہے جو

صرف کہاوت نگار اور محاوروں پر عبور رکھنے والا شخص تھا یہی وجہ ہے کہ اسلام کی مخالفت میں قبائلی مفادات اور پرانے مذہبی عقائد ہی کھڑے ہوئے اسے کسی فلسفیانہ چیلنج کا سامنا نہیں کرنا پڑا جب کہ چند سو سال کے اندر ہی مسلم عقلی تحریکوں سے اس کا مقابلہ شروع ہو گیا۔

گو علم کی جستجو اور اس کے حصول کے بارے میں پیغمبرؐ اسلام کی چیدہ چیدہ ہدایات موجود تھیں لیکن نظام تعلیم کے عدم وجود کی وجہ سے وہ موثر ثابت نہ ہو سکیں۔ تعلیم کے ساتھ مسجد کو غیر مربوط طریقے سے جوڑا گیا۔ مقدس متن کو رٹے سے یاد کرنا اور نسل در نسل چلنے والی حکایات وروایات کی تشریح وتعبیر میں الجھے رہنا مسلمانوں کی بنیادی ''تعلیمی کاوش'' تھی۔ نہ اساتذہ کی تربیت کا کوئی بندوبست نہ ان کی تنخواہیں مقرر اور نہ تعلیم کے لیے کوئی فنڈ مختص تھا۔ بچوں کی تعلیم کو والدین پر چھوڑا ہوا تھا۔ اساتذہ پرائیویٹ ہوا کرتے تھے۔ ریاستی سطح پر تعلیمی نظام وضع کرنے کی طرف کبھی توجہ نہ دی گئی۔ البتہ جب فارس، شام، مصر اور اسپین کی تہذیبوں سے اسلام کا تعارف ہوا تو علمی لحاظ سے تاریک اسلامی دنیا پر نئے افق اجاگر ہوئے ورنہ اس سے پیشتر تعلیمی سرگرمیوں کا دھارا اپنی سمت اور متن کے لحاظ سے بدستور شرعی ضرورتوں تک ہی محدود رہا۔ اس دوران جو بھی اہل قلم ابھرے وہ نقالوں اور مفسروں کے سوا کچھ نہ تھے چنانچہ اسلام کے ابتدائی دو سو سال فتوحات کے جوش وخروش میں گزر گئے۔ سلطنت وسیع ہوتی گئی، مقبوضہ علاقوں سے درہم ودینار اور مال متاع کے انبار اکٹھے ہو رہے تھے۔ غلاموں سے بازار بھر رہے تھے اور لونڈیوں سے حرم.....لیکن اب اسلام بدوی سماج اور صحرائے عرب کے نسبتاً علمی طور پر بانجھ علاقے سے بہت دور ترقی یافتہ ثقافتوں کی حامل زمینوں پر قدم رکھ چکا تھا۔ غیر عرب، نومسلم اور غیر مسلم سبھی مل کر نئی عرب تہذیب کو رقم کر رہے تھے۔ یونانی فلسفہ ودیگر علوم کے عربی زبان میں ترجمے ہونے شروع ہو گئے۔

مسلمانوں میں جو نیا دانشور طبقہ پیدا ہوا، انھوں نے یونان کے قدیم فلاسفروں کی طرح فکر کے جدلیاتی (Dialectic) اسلوب کو اپنایا۔ وہ اس بات کو جان گئے کہ نئے نئے سوال اٹھا کر

اوراپنے ماضی وحال کوزیرتنقید لاکر ہی علم کی شمعوں کوفروزاں کر سکتے ہیں۔ چوتھی صدی ہجری میں ''محبان فلاسفہ'' کے نام سے ایک کتاب بصرے میں شائع ہوئی جس میں یونانی فلسفے کو اسلامی روایات کے ساتھ ضم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ اپنے وقت کے موجود علم کا انسائیکلو پیڈیا تھا جس کے بین السطور میں یہ خیال پیش کیا گیا تھا کہ مذہب کو فلسفے کی ضرورت ہے دوسرے لفظوں میں وحی مبنی برعقل ہونی چاہیے.....روایت پسندوں کے لیے یہ نظریہ نا قابل قبول تھا۔مسلمانوں کی بدنصیبی یہ رہی کہ شروع سے ہی ''مذہبی سائنس'' (Science of religion) اور (Science of Ancients) (یونانی قدماء کی سائنس) کے درمیان ایک واضح خط کھینچ دیا گیا۔ اول الذکر میں حدیث' قرآن' فقہ' شریعت' قوانین اور ضابطے اور ثانی الذکر میں فلسفہ' منطق' فزکس مابعد الطبیعیات' ریاضیات اوعلم ھیئت شامل تھے۔ دونوں طرف کے فریق ایک دوسرے کو دشمنوں کی نظر سے دیکھنے لگے۔ فلاسفروں اور مذہبی کٹر پرستوں نے بقائے باہمی کو ماننے سے انکار کر دیا' اسی نقطہ نظر کی وضاحت سی اے قادر اپنی کتاب ''اسلامی دنیا میں فلسفہ و سائنس'' میں اس طرح کرتے ہیں' ''تاریخ اسلام کی تہذیب میں عقل ہمیشہ مشکوک رہی ہے اور ہر وہ شخص جس نے عقل کو دیگر ذرائع پر فوقیت دی' وہ کفر کے فتویٰ سے نہیں بچ سکا'' اسی طرح علامہ اقبال' اسباب زوال بیان کرتے ہوئے ایک سبب شریعت کی بالادستی (Complete Authority of Legislation) کوقرار دیتے ہیں۔فطرت کے عمل کو جاننے کے لیے عقل اور فلسفہ کا استعمال ضروری تھا جب کہ تقلید پسند' مسلمان مفکرین کے پاؤں میں عقائد کی بیڑیاں باندھنا چاہتے تھے لہٰذا دونوں گروپوں کے بیچ ایک مسلسل کشمکش شروع ہوگئی۔

چنانچہ آج ہم جسے اسلام کا عظیم الشان ثقافتی دور کہتے ہیں اس میں مرکزی کردار ادا کرنے والے سب اسلام کے بنیادی دھارے سے انحراف رکھنے والے سیکولر فکر کے حامل لوگ تھے۔ یہ دور تقریباً تین سو سال (900ء سے 1200ء) تک محیط ہے۔ جب اسلامی دنیا میں علمی' فکری اور دانش ورانہ سرگرمیوں کی نہایت قابل ذکر ترقی ہوئی جس پر اہل مغرب بھی رشک کناں

ہیں۔امیہ دور میں ہی سائنسی علماء خاص طور پر ماہرین طب دمشق میں دوسرے علاقوں سے آ کر اکٹھے ہو گئے۔ان میں زیادہ تر قسطنطنیہ کے نسطوری (Nastorian) عیسائی یا یہودی لوگ تھے۔ جن کے نام عربوں سے ملتے جلتے تھے۔انھوں نے اقلیدس، ارسطو، افلاطون، ارشمیدس، ہپو کریٹس، گالن (Galen)، ٹولمی (Pt olmy) اور ہیرو (Hero) جیسے قدیم مغربی مفکرین کی کتابوں کے عربی زبان میں ترجمے کیے جس سے عربی زبان کے علم وادب میں وسیع اضافہ ہوا لیکن امیہ خلفاء کی زیادہ تر توجہ فوجی مہمات کی طرف ہی مرکوز رہی۔لہٰذا ان کا دور علم و دانش کی ''شیر خواری'' کا زمانہ تھا لیکن ساتویں عباسی خلیفہ مامون الرشید کے زمانے میں جب شام، ایران اور اسپین کی باہم ثقافتیں آپس میں ملیں تو اسلامی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔بغداد تجارت، صنعت اور دانش کا مرکز بن جاتا ہے۔جنس اور نقد کی صورت میں 27 کروڑ دینار سے زیادہ ٹیکس مرکزی حکومت کے پاس پہنچ رہے تھے چنانچہ عرب مسلمانوں کے پرانے قبائلی سطح کے جھگڑے اور نئے اور پرانے مسلمانوں کے درمیان امتیازات مٹانے میں، دولت کی فراوانی، باہمی شادیوں کا رواج، کثرت ازدواج، لونڈیاں اور غلام اہم کردار ادا کر رہے تھے۔نومسلم تاجروں، استادوں، ادیبوں، اسکالروں اور طبیبوں کا ایک نیا طبقہ پیدا ہو رہا تھا جو علمی اور مادی دولت کی نئی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ خلیفہ مامون کا ایک جنرل جب مرا تو اس کے پاس سے 1300 کپڑے بغیر استعمال کے نکلے۔ مامون کی سوتیلی ماں زبیدہ خاتون موتی جڑے جوتے استعمال کرتی اور کھانے کی میز پر جواہرات سے مزین سونے اور چاندی کے برتن استعمال ہوتے چنانچہ اقتصادی تبدیلی سماجی اور سیاسی ڈھانچے کو تبدیل کر رہی تھی۔ مامون کو فلسفے اور سائنس سے ذاتی دلچسپی تھی۔لہٰذا اس کی سوچ کٹر پسندانہ اسلام سے دور ہوتی گئی۔وہ ہر ہفتے اپنے محل میں اسکالروں کا اجلاس بلاتا تا کہ مختلف نظریاتی سوالات پر بحث ومباحثہ ہو سکے۔ادھر اسی کے دارالحکومت میں معتزلہ کے نام سے بڑی ہی ریڈیکل اسلامی تحریک نے جنم لیا۔معتزلین خود کو اہل توحید وعدل کہتے تھے۔انھوں نے کلاسیکل اسلام پر بڑے ہی اچھوتے اور فلسفیانہ سوالات اٹھائے۔بقول ان کے اللہ عدل کرنے

کا پابند ہے۔ لہٰذا قسمت اور تقدیر نہیں ہوسکتی اس طرح کوئی شفاعت بھی نہیں ہوسکتی کہ انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ ان کا یہ بھی ایمان تھا کہ نیکی اس لیے نیکی نہیں کہ اسے خدا کی منظوری حاصل ہے یا بدی اس لیے بدی نہیں کہ اسے خدا ناپسند کرتا ہے' ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ بدی اور نیکی اسقدر واضح ہیں کہ شریعت کی راہنمائی کی کوئی ضرورت نہیں۔ انھوں نے خدا کے ساتھ منسوب شخصی صفات کو بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ جیسے باتیں کرنا' خوش ہونا' رحم کرنا' غضب میں آ جانا' اعمال ترازو میں تولیں جائیں گے۔ جنت میں پھل' تالاب' نہریں اور تالاب ہوں گے۔ جن میں ''سفید پانی اور شہد سے میٹھا دودھ'' ہوگا۔ یا وقت تخلیق خدا اور انسان کے درمیان کوئی مکالمہ ہوا تھا۔ انھوں نے جسمانی معراج اور معجزوں کے سرزد ہونے سے بھی انکار کیا' تمام معتزلی مفکر اس بات پر متفق تھے کہ تمام عقائد اور نظریات کا پیمانہ عقل ہونا چاہیے۔ خلیفہ مامون اس تحریک سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اسے ''سرکاری مذہب'' بنانے کا فرمان جاری کر دیا۔

مامون نے ایک بیت الحکمت گھر House of Wisdom بنایا جس کے ترجمے کے شعبہ کا انچارج اس دور کی ایک بہت بڑی علمی شخصیت حنین ابن اسحاق (غیر مسلم) تھا۔ اس نے ساری زندگی بغداد میں گزار دی اور بڑے پیمانے پر علمی اور فکری کام سرانجام دیا۔ اس دور کے حلفا نے عیسائی مفکرین اور سائنسی علماء کو وہ تمام وسائل اور ذرائع مہیا کیے جس سے وہ سفر کر کے یونان سے مخطوطے بغداد لاتے اور وہاں فلکیات' ریاضیات' معدنیات' بناتیات' کیمیا اور میکانکی علوم سے متعلق کتابوں کے ترجمے ہوتے۔ اس کے علاوہ ان دانشوروں نے فارسی اور سنسکرت کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا۔ ہندوستانیوں سے صفر کا استعمال سیکھ کر عربوں نے اعداد میں انقلاب برپا کر دیا۔ خلیفہ مامون نے ایک عمدہ اکیڈمی اور رصدگاہ بھی بنوائی جس میں فلکیاتی مشاہدات کا باقاعدہ طور پر ریکارڈ کیا جاتا تھا۔ جہاں اسلام کے مشرقی حصے میں جابر' ابن سینا' الخوارزمی' الکندی اور البیرونی جیسے علماء سائنس اور فلسفے کی تمام شاخوں پر تحقیق کر رہے تھے۔ وہاں اسلام کے یورپی علاقے خلیفہ عبدالرحمان سوم کے دربار میں ڈاکٹر (Hasdai Ben

(Shaprut نامی ایک یہودی وزیر تھا جس نے سائنسی کام اور علوم کی بے حد سرپرستی کی اور ان کے عربی زبان میں ترجمے کروائے۔ اس طرح مغرب میں مسلم فلاسفی کی پہچان ابن رشد اسپین کا رہنے والا تھا۔ گو وہ پیشہ کے لحاظ سے طبیب تھا لیکن اس کا فلسفے پر کئی جلدوں پر مشتمل ضخیم کام قدامت پرست ملاؤں کے غضب کا نشانہ بنا اور اس پر یہودی ہونے کا فتویٰ صادر کیا گیا۔ مراکش اور اسپین میں اس کی تحریروں کو آگ لگا دی گئی۔ اس پر الزام لگایا گیا کہ یہ عقیدے سے منکر ہے کہ اس دنیا اور تمام مخلوقات کو خدا نے بنایا ہے جب کہ ابن رشد مسلسل تخلیقی عمل پر یقین رکھتا تھا۔ بقول اس کے یہ کہنا غلط ہے کہ خدا نے یہ دنیا اور مخلوقات عدم سے بنا ڈالے تھے۔ تغیر پذیر دنیا میں ہر جبلت تجدید کے عمل سے گزرتی ہے اور وہ اپنی سابقہ ھیئت سے ایک نئی شکل میں بدل جاتی ہے۔ ابن رشد نے فلسفہ ارتقاء پیش کیا' اس کے نزدیک دو طرح کی ابدیت تھی۔ محرک اصلی (خدا) ابدی بھی ہے اور بغیر سبب (Cause) کے بھی جب کہ باقی ساری کائنات علت رکھتی ہے۔ اس نے شعور (Intellect) اور روح کو بھی ایک ہی قرار دیا۔ اس طرح مسلم قوم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ مغربی عقل اور روایتی اسلام کو ملایا جا سکتا ہے۔ اس نے قرآنی آیات کے حوالے دے کر اور تشریحیں کر کے سمجھانا چاہا لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا.....ابن رشد جس قوم میں پیدا ہوا اس نے اسے مسترد کر دیا جب کہ یہودی اور عیسائیوں نے اس کے نظریات کا بڑی سنجیدگی سے مطالعہ کیا۔

بارھویں صدی میں آ کر اسلامی دنیا میں علوم وفنون اور فلسفہ وفکر کا ایسا زوال شروع ہوا جس کے بعد مسلم دنیا پھر نہ اٹھ سکی۔ جس کا ایک سبب صلیبی جنگوں میں ملوث ہونا اور منگولوں کی تباہ کاری تو تھا ہی لیکن جس اسلامی دور پر ہم نازاں ہیں اسے اسلام کے نام پر ہی بند کر دیا گیا تھا۔ مذہبی شدت پسندی نے زور پکڑا اور مبنی پر عقل باتیں کرنے کی پابندی لگا دی گئی۔ اس تحریک کی قیادت ہمارے محترم امام غزالی نے کی' اسلامی فلسفہ وعلم کی تاریخ میں امام غزالی کا نام ولن کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔ اسلامی دنیا میں سائنس اور علوم عقلیہ کی ترقی جب اپنے عروج پر

تھی۔امام غزالی نے ان کے خلاف اسلامی جہاد شروع کر دیا۔اس کا کہنا تھا کہ مسلمان علوم عقلیہ کی بدولت اسلام کے بنیادی عقائد اور مقاصد سے دور ہوتے جا رہے ہیں چنانچہ انھوں نے عقل دشمن تھیوری بنانے میں عقل کا خوب استعمال کیا.....! غزالی کا کہنا تھا کہ انسانی حسیات اور عقل کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے اس پر بھی شک کیا جا سکتا ہے۔عقل اور حواس سے جو حقیقت نظر آتی ہے وہ بھی فریبانہ Illusory ہو سکتی ہے لہٰذا عقلی علم سے اعلیٰ تر اتھارٹی عقیدے کی ہے۔ انھوں نے ایک مضحکہ خیز دلیل سے سائنسی علم کے نہایت بنیادی اصول علت (Theory of Causulity) کو رد کر دیا۔ بقول اس کے ''جب دو واقعات یکے بعد دیگرے تسلسل سے واقع ہوتے ہیں تو ہماری عادت بن جاتی ہے کہ ایک کو ہم سبب اور دوسرے کو مسبب سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔اگر علت و معلول کا باہمی رشتہ نہ قابل تنسیخ' ضروری اور ناگزیر ہوتا تو یہ خدا کی شان کے خلاف ہوتا (کہ وہ کوئی معجزہ ہی نہ دکھا سکتا!'' انھوں نے طبعی سائنس کے مقابلے میں ''مذہبی سائنس'' کے احیاء کا نعرہ لگایا۔جس کا مقصد مسلمانوں کو بنیاد پرستی کی طرف واپس لے جانا تھا تاکہ وہ تسخیر کائنات کی بجائے خدا کی عبادت میں خود کو وقف کریں جو بقول غزالی کے انسانی زندگی کا واحد مقصد اور فرض اولین ہے۔غزالی کی پر جوش تحریروں اور تعلیم نے مسلمانوں کے اندر سائنسی اسپرٹ کو تباہ کر کے دکھ دیا اور علوم عقلیہ کے خلاف ایسی زور دار تحریک اٹھی کہ فلسفے کی کتابیں جہاں کہیں دیکھی جاتی انھیں جلا دیا جاتا۔ابن رشد نے ایک فلاسفر ہونے کے ناطے غزالی کی فلاسفی دشمن کتاب کے مقابلے میں ''تحفہ التحافہ'' نامی کتاب میں فلاسفروں کا دفاع کیا تاکہ وہ مرتد ہونے کے الزامات سے بچ سکیں اس لیے کہ غزالی کا نعرہ تھا'' دین کا دشمن' سماج کا دشمن'' ابن رشد نے جواب میں لکھا کہ غزالی نے فلاسفروں کو غلط سمجھا ہے۔فلاسفر اس بات کو مانتے ہیں کہ خدائی علم انسانی علم سے مختلف ہے لیکن ابن رشد کی ساری وضاحتیں غزالی کی اسلام بچاؤ تحریک کے سامنے بے کار ثابت ہوئیں۔اس کی تاریخی وجہ یہ تھی کہ تمام علمی اور سائنسی سرگرمیاں ایک ایلیٹ طبقے اور اسلامی سلطنت کے صرف چند بڑے بڑے شہروں تک محدود تھیں۔تعلیم عامہ کی

طرف توجہ اس ''سنہرے دور'' میں بھی بالکل نہ دی گئی۔ خاص طور پر وسیع دیہاتی علاقے ناخواندگی اور جہالت کے مکمل اندھیروں میں رہ رہے تھے۔ چنانچہ غزالی اینڈ کمپنی کی کوششوں سے عالم اسلام مذہبی جنونیت کی ڈگر پر واپس چلا گیا..... جہاں ایک ہزار سال گزرنے کے بعد آج تک قائم ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فلاسفی کے ایک سابق سربراہ پروفیسر قادر اپنی محولہ بالا کتاب میں لکھتے ہیں۔'' غزالی کی تحریک سے نہ صرف مسلمان فلاسفی کے خلاف ہو گئے بلکہ سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ انھوں نے (Philosophize) کرنا یعنی سوال اٹھانا ہی چھوڑ دیا۔ اقبال اظہار فخر کرتا ہے کہ مسلم مفکروں اور سائنس دانوں نے ارسطو کے خیال آرائی پر مبنی علم کی بجائے تجربے اور مشاہداتی علم کی بنیاد رکھی لیکن غزالی کا کہنا تھا کہ صداقت کے جاننے کا یقینی رستہ کشف'' ہے۔ ہمیں عقل، منطق اور دلیل کی بجائے عقیدے پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ عقلی اور تجرباتی علم سے روحانی علم (Mystic Knowledge) افضل ہے۔ غزالی نے علم آگہی کے حصول کا ذاتی تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس نے اپنے وقت کے سب علم کھنگال مارے، سب کتابیں پڑھ لیں لیکن کچھ پلے نہیں پڑا۔ بس ایک دن ''خدا کی روشنی'' دل میں اتری کہ سب صداقتوں کے در کھل گئے.....! بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ غزالی نے مسلمانوں کے لیے راہ نجات تصوف تجویز کیا اور صوفیوں کا ایک ڈیرا قائم کیا۔ بقول اقبال بزبان ابلیس مسلمانوں کا بیڑا غرق کرنے کے لیے ضروری تھا۔

پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

پوری مسلم تاریخ میں عورت پر رسمی اور باقاعدہ تعلیم کے دروازے بند رہے ہیں چنانچہ ہمارا یہ ''مفکر تعلیم'' غزالی بھی عورتوں کی تعلیم کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کرتا ہے اس لیے کہ وہ عورتوں کے گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنے کے سخت خلاف تھا۔ غزالی کا تعلیم نسواں کا نظریہ ملاحظہ ہو'' خاوند کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی بیوی کو نماز پڑھنا اور دیگر مذہبی رسومات ادا کرنا سکھائے.....!!'' غزالی کی سربراہی میں اسلام میں مدرسے کے نام سے ایک اور تعلیمی ادارے کا

جنم ہوا۔ وہ بنیادی طور پر تعلیم بالغاں کے لیے مخصوص تھا۔ اسے بھی تقلید پسند حکمرانوں کے غیر عقلی عقائد (Dogma) پھیلانے کیلئے کھولا گیا تھا۔ حکومت نے ان مدرسوں کے اساتذہ کو پہلی دفعہ تنخواہیں دینی شروع کیں۔ ''مدرستہ النظامیہ'' کا پہلا باقاعدہ استاد غزالی بنا۔ غزالی نے نوجوانوں کو مدرسے کی طرف کھینچنے کے لیے کھیل اور ڈرامے شروع کیے۔ جہاں تک تدریسی طریقہ کار (Teaching Method) کا تعلق تھا۔ حرف بہ حرف زبانی یاد کرنے کی روایت کبھی منسوخ نہ کی جاسکی۔ اساتذہ عبارت کو تحت اللفظ اور خوش الحانی سے پڑھنے (قرات وتلاوت) پر مسلسل زور دیتے رہے اور شاگرد دیے گئے مواد کو رٹے سے زبانی یاد کرنے کو تعلیم سمجھتے رہے۔ اساتذہ زبانی پڑھانے پر سہولت محسوس کرتے تھے۔ گو اس وقت تک اسلامی روایات لکھی جا چکی تھیں لیکن ایسے طریقہ تدریس سے متن کے غلام (Slaves of Text) پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ ان کے خیال کے مطابق ان کا کام طے شدہ تفسیروں کو بیان کرنا اور ان کی املاء (Dictation) دینا تھا۔ جب غزالی جیسی جاندار شخصیت نہ رہی مدرسوں کا ملاؤں کی اجارہ داری میں اور بھی خانہ خراب ہو گیا۔ گو مدرسے چھوٹے بڑے شہروں میں پھیلتے رہے لیکن انھیں چلانے میں اگلوں نے پچھلوں کا ہی اتباع کیا چنانچہ مقدار میں اضافے کے باوجود صدیاں گزرنے کے بعد بھی تعلیمی نظام میں کوئی کوالٹی نہ آسکی بلکہ غزالی کے قائم کردہ تعلیمی اور تدریسی معیارات بھی برقرار نہ رہ سکے۔ ابتدا میں علم کی جائز محبت اور جستجو میں طلبا اسلامی ثقافتی مراکز کی طرف کھنچے چلے آئے لیکن بقول شخصے ''وہاں جتنی بھی شہد کی مکھیاں اکٹھی ہوئیں ان کی غالب اکثریت (Drones) غیر زرخیز مکھیوں پر مشتمل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کٹر عقیدہ پرستی پر مبنی غزالی کا ترتیب کردہ مسلم نظام تعلیم تعلیمی مقاصد کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔

عرب علماء نے جو طبی سائنس ایجاد کی وہ شفاخانوں میں سسکیاں لیتی رہ گئی' اسے تعلیمی اداروں کے نصاب میں شامل نہ کیا گیا' علم کیمیا کو بھی صرف چند لوگ انفرادی اور پرائیویٹ طور پر پڑھایا کرتے تھے..... مدرسوں کے دروازے علم کیمیا پر بند رکھے گئے۔ عرب فلاسفی پیچھے ہٹتی

شکست کھاتی چلی گئی۔ جسے یورپ نے اختیار کرلیا۔ یہ تھا اسلامی تاریخ کا وہ تعلیمی اور ثقافتی ڈھانچہ جو دینیات کے گرد ہی گھومتا رہا۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر فطری علوم سے بیر رکھنے کی سائیکی پیدا ہوگئی۔ ان کے کانوں میں صدیوں سے انڈیل دیا گیا کہ ان کے لیے ایک ہی کتاب کافی ہے' وہی سارے علوم کا منبع ہے..... اس سے باہر علوم کی تلاش دین سے دوری پیدا کرتی ہے۔ جب مغربی اقوام ترقی کر گئیں تو عام مسلمانوں میں یہ متھ ڈال دی گئی کہ ترقی یافتہ قوموں نے سب کچھ اسی کتاب سے حاصل کیا ہے.....!! اس طرح کی باتیں پھیلانے کا ایک ہی مقصد نظر آتا ہے کہ ذہنی اور مادی پس ماندگی مسلمانوں کا مقدر بنی رہے۔ ملاؤں نے مسلمانوں کو نہ تو روحانی کتاب (قرآن) کو سمجھنے دیا اور نہ ہی انھیں مادی کتاب (کائنات) کو تسخیر کرنے دیا.....

یہ کہنا غلط ہے کہ مسلم تاریخ بحیثیت مجموعی خرد افروزی کی وارث رہی ہے۔ مسلم فکر پر ہمیشہ سے تقلیدی' رجعتی اور راسخ العقیدہ کٹر مذہبی پیشوائیت کا غلبہ رہا ہے۔ اسلام کے علامتی مراکز مکہ و مدینہ کبھی بھی علم پروری کی شہرت حاصل نہ کر سکے۔ وہ بدستور فکری قدامت پرستی کی نمائندگی کر رہے ہیں چنانچہ مسلم دنیا کے اس عظیم ثقافتی ابھار کو کسی اسلامی اسپرٹ کے ساتھ منسوب کرنا یا اسے اسلام کی کوئی خصوصیت قرار دینا یوں غلط ہے کہ علم و دانش کے اس ابھار کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا بلکہ ان سماجی' سیاسی' معاشی' تاریخی حالات کا نتیجہ تھا..... جس میں حکمران طبقہ یا اس کا کچھ حصہ آزاد خیال ہو چکا تھا۔ کوفے' بصرے' بغداد' اصفہان' نیشاپور' دمشق اور قاہرہ میں صنعت و تجارت اور وسیع العریض سلطنت کے ٹیکسوں کی عظیم آمدنی سے مڈل کلاس دانش نے جنم لیا' جو بنیادی طور پر سیکولر سوچ رکھتی تھی۔ جنھوں نے مغرب کے قدیم سائنسی کاموں کے ترجمے کر کے ان کی دریافت نو کی اور تحقیق کو مزید آگے بڑھایا۔ جس میں مسلم' عیسائی اور یہودی بھی شانہ بہ شانہ کام کر رہے تھے۔ البیرونی کے الفاظ میں ''یہ عرب زبان تھی جس میں دنیا بھر کے سائنسی علوم ترجمہ ہو کر اکٹھے ہو گئے اور ان افکار نے ایک نقطے پر ہم آہنگ ہو کر ہمارے دلوں کو گرما دیا'' آج احیائے اسلام کا نعرہ بلند کرنے والے جب اسلامی تاریخ کے اس روشن دور پر اپنی

''ملکیت'' جتلاتے ہیں تو وہ اس حقیقت کو ہماری نظروں سے چھپا رہے ہوتے ہیں کہ وہ دور علوم و فنون کی ترقی ریڈیکل اور تشکیکی نظریات کے ساتھ علوم باطن کے فروغ کا زمانہ تھا اور مسلمانوں کے ارتقاء کے اس اہم مرحلے کو احیائے اسلام کے نام پر تباہ کیا گیا تھا۔

سب سے پہلی بغاوت ''اسلامی قانون دان'' امام حنبل نے کی جو کٹر لفظ پرست (Literalist) تھے ان کا کہنا تھا کہ ''کسی ایسی چیز پر بحث کرنا جس پر نبی نے بحث نہ کی ہو..... حرام ہے'' اس نے علم اور سائنس کی مذمت کی اور عقل پسندی کے خلاف مقدس جنگ شروع کرنے کا اعلان کیا۔ان کی مشتعل تقریروں سے بغداد کی سڑکوں پر عقیدہ پرستوں اور عقل نوازوں کے بیچ فسادات اور خون ریزی کے واقعات ہونے لگے۔نتیجہ یہ نکلا کہ خلیفہ وقت نے ریاستی قوت کو استعمال کیا اور امام حنبل کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔لیکن جب سنی العقیدہ متوکل نامی شخص نے خلافت سنبھالی تو اس نے قاضیوں اور ملاؤں کے ساتھ مل کر چن چن کر علم دوست افراد کا قتل شروع کر دیا۔کاتبوں سے حلف نامے لکھوائے گئے کہ وہ فلسفہ و سائنس سے متعلقہ تحریروں کی کتابت نہیں کریں گے۔مسجد کے میناروں پر کھڑے ہو کر کتابوں کو آگ میں پھینکا جاتا اور ہجوم کو ان لوگوں پر لعنتیں بھیجنے کو کہا جاتا جو ان پر یقین رکھتے تھے۔علم منطق کو حرام قرار دینے کا حکم جاری کیا گیا۔حالات اس قدر دہشت انگیز کر دیے گئے کہ ایک اندھے اسکالر حسن ابن محمد نے مرنے سے پہلے بیان دیا ''خدا سچا ہے' ابن سینا جھوٹا ہے'' غزالی نے اعلان کیا کہ ابن سینا اور ابن رشد جیسے مسلم مفکروں کو کافر قرار دے دینا چاہیے جو ارسطو کی فلاسفی کا پرچار کرتے ہیں۔بقول غزالی اس پر یقین کرنا فضول ہے کہ دنیا فزیکل قوانین کے تحت چل رہی ہے۔اس کائنات میں ہر کام اور عمل خدا کی براہ راست مرضی اور مداخلت سے انجام پاتا ہے۔اس نے مثال دیتے ہوئے کہا ''یہ کہنا غلط ہے کہ آگ کپڑے کو جلاتی ہے حالانکہ خدا نے کپڑے کو خود راکھ میں تبدیل کیا ہے' ہوسکتا ہے اس نے یہ کام فرشتوں کی مدد سے کیا ہو یا بلا واسطہ خود انجام دیا.....!!'' غزالی اس ذہنیت کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں چنانچہ ان کی تحریروں سے اس ذہن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔غزالی نے کہا

کہ گو ریاضیات ممنوعہ مضمون نہیں لیکن اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ اس سے انسان کفر کی طرف چلا جائے کیونکہ ریاضیات کا طالب علم سوالوں کو مکمل صحت و فصاحت (Clarity and Precision) کے ساتھ دیکھنے کا عادی ہوجاتا ہے لہٰذا امکان ہوسکتا ہے کہ چیزوں کو بہت واضح اور ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی آرزو اسے وحی کے خلاف کردے..... خدا کی باتیں نہ سمجھ میں آنے والی ہوتی ہیں۔ خدا کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کس وقت کیا کردے۔ غزالی نے مسلم نوجوانوں کو پیغام دیتے ہوئے کہا ''تم سائنسی کتابیں پڑھ کر اپنی راتوں کی نیند کیوں حرام کرتے ہو؟ مجھے سمجھ نہیں آتی تمہارا اس سے کیا مقصد ہے؟ کیا تم اس دنیا سے مادی فوائد حاصل کرنا چاہتے ہو؟ اپنے ہم عصروں سے آگے بڑھنا چاہتے ہو..... تم پر افسوس ہے بہت افسوس ہے.....'' یہ ہے ان کا پیغام مسلمان قوم کے نام!

مسلم دنیا کے اس وقت کے علمی عروج کی مندرجہ ذیل وجوہات سامنے آتی ہیں۔

1- وسیع و عریض مفتوحہ علاقوں سے آمدنی آنے کی وجہ سے خوش حالی اور معاشی ترقی کا عمل شروع ہوا۔ نئی دولت سے سمرقند، بخارا اور بغداد جیسے شہر تعمیر ہوئے جہاں اپنے عہد کی جدید ترین سہولتوں کے ساتھ اعلیٰ پائے کے تعلیمی اور صحت کے مراکز قائم ہوئے۔

2- مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے باہمی امتزاج سے رواداری کا مضبوط ماحول پرورش پایا۔ مسلمان، عیسائی اور یہودی ہر سطح پر مل کر کام کر رہے تھے اور انہی کے مختلف خیالات و نظریات اور مباحثہ و تحقیق سے ایک بڑے علمی ابھار کا جنم ہوا۔

3- مذکورہ علمی کلچر سے حکمران طبقہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا چنانچہ اس دوران کچھ ایسے افراد خلیفہ بنے جو خود روشن خیال اور علم کی جستجو سے سرشار تھے انھوں نے ذاتی دلچسپی سے سرمایہ، سہولتیں اور پورا انفراسٹرکچر مہیا کر کے دیا جو اس طرح کا علمی ابھار تقاضہ کرتا ہے۔

4- نہایت اہم بات غور کرنے کی یہ ہے کہ مذکورہ تمام سائنسی تحقیق اور علمی کامیابیاں الگ تھلگ معرض وجود میں نہیں آ رہی تھی۔ ان کے پس منظر میں اور شانہ بہ شانہ خدا، مذہب اور کائنات

کے بارے میں بڑے بڑے فکری سوالات اٹھانے کی مضبوط فلسفیانہ تحریکیں چل رہی تھیں لہٰذا سائنس کے فروغ کو جس آزادانہ فکری اور منطقی ماحول کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی وہاں موجود تھا۔

5- مذکورہ مسلم سائنس دانوں اور مفکروں میں کوئی بھی عقائد کو حرف آخر قرار دینے کو تیار نہ تھا وہ عقل کے مطابق وحی کی نئی تعبیریں کر رہے تھے اور عقل کو وحی پر فوقیت دینے کے حامی تھے مثلاً ابن سینا نے شراب کے حرام ہونے کے قرآنی حکم کی یوں تعبیر کی ''شراب بے وقوفوں کیلیے حرام قرار دی گئی تھی۔ دانشوروں کے لیے نہیں'' اس نے پارسائی کی زندگی پر طنز کرتے ہوئے کہا ''میں تنگ لمبی زندگی سے چھوٹی سی کشادہ زندگی کو ترجیح دیتا ہوں'' طبی سائنس دان اور فلاسفر الرازی سے جب یہ سوال پوچھا گیا کہ کیا ایک فلاسفر نزول شدہ مذہب کی پیروی کر سکتا ہے؟ تو اس کا کھلا جواب تھا کہ ''ایک شخص جہالت' تضادات' عقیدہ پرستی اور نا قابل تغیر موقف پر قائم رہ کر فلسفیانہ طور پر کیسے سوچ سکتا ہے؟ حکمرانی عقیدے کی نہیں عقل کی ہونی چاہیے۔ عقل کو کنٹرول کرنا چاہیے نہ کہ عقل کو کنٹرول کیا جائے۔ عقل کو رہنمائی کرنی چاہیے..... نہ کہ عقل کی راہنمائی کی جائے''

یاد رہے کہ یہ وہی رازی ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا۔

اسی کشمکش میں گزری میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومیؒ کبھی پیچ وتاب رازی

علم اور سائنس اپنی فطرت میں ہی سیکولر سرگرمی کا نام ہے چنانچہ یہ ان معاشروں میں پھیلتے ہیں جو سوال اور انکوائری پر پابندیاں نہ لگائے۔ ریاست اور حکمران بھی سائنسی ترقی کے فروغ میں والہانہ شریک ہوں اور اس کے لیے بھرپور وسائل مہیا کر رہے ہوں۔ علمی ترقی کے اس ابھار کے پیچھے یونانی فلسفہ اور اسلام کے بنیادی دھارے سے منحرف معتزلہ' اخوان الصفا اور وحدت الوجودی تحریکوں کے پیدا کردہ فکری ماحول کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ مذکورہ

بالا شرائط جو بھی معاشرہ پوری کرے گا وہاں سائنسی ترقی کے امکانات پیدا ہو جائیں گے چاہے اس معاشرے کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو' مسلمانوں کے اس سنہرے دور سے ہمارے لیے یہ سبق ہے کہ جب تک ہم سیاسی' معاشی' سماجی' علمی اور بین الاقوامی معاملات میں مذہب کو گھسیٹنا بند نہیں کریں گے ہم ترقی نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنے مسائل خود عقل سے سوچ کر حل کرنے ہوں گے۔ ہمیں اکیسویں صدی میں اب یہ مان لینا چاہیے کہ مذہب کی اپنی مجبوریاں ہیں اسے شخصی ایمان اور روحانی وسیلہ تسکین کی حد تک محدود رہنا چاہیے۔ وہ ہر مسئلہ کا حل اور ہر سوال کا جواب نہیں ہوسکتا.....عقائد کی نظر سے صداقتیں دھندلا جاتی ہیں جب صحیح دیکھ نہیں پائیں گے۔ فیصلے بھی غلط ہوں گے۔ چنانچہ نتائج بھی اپنے ہی خلاف نکلیں گے۔ مسلم امہ کو 14 سو سال کے بعد اب ذہنی بلوغت کا اظہار کرنا چاہیے۔ عقل اور سائنس کی طرف راغب ہوئے بغیر کوئی دوسری راہ باقی نہیں ورنہ زوال اور پس ماندگی کا عمل جاری رہے گا.....

مسلمانوں کی سائنسی ترقی اور خوشحالی کا دور دورہ ان کے تقوی و پرہیز گاری پر کوئی خدائی انعام نہیں تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر صاحبان شریعت مسند اقتدار پر براہ راست قابض ہوتے تو اس سنہری دور کا اسلامی تاریخ میں نام ونشان بھی نہ ہوتا نہ ہی سائنس اور سائنس دانوں کی سرپرستی اسلامی حکومتوں کی مستقل پالیسی تھی۔ کسی بھی درباری اتھل پتھل اور سازشوں کے نتیجے میں ان مسلم مفکرین کو جان بچا کر بھاگنا پڑتا تھا۔ عظیم عرب فلاسفر الکندی المامون کے دربار کا ایک روشن ستارہ تھا لیکن عقل پسند خلیفہ المعتصم کے بعد جب کٹر عقیدہ پرست المتوکل خلیفہ بنا تو علماء نے فوراً خلیفہ کو یقین دلا دیا کہ الکندی خطرناک نظریات کا حامل ہے۔ خلیفہ نے الکندی کی ذاتی لائبریری ضبط کرنے کا نہ صرف حکم دیا بلکہ بے ہجوم کے سامنے ساٹھ سالہ بوڑھے فلاسفر کو 50 کوڑے لگائے گئے۔ ہر کوڑے کے بعد اللہ اکبر کے نعرے لگتے تھے! الکندی اس توہین آمیز سلوک اور صدمے سے پھر نہ اٹھ سکا۔ اور موت تک خاموشی اختیار کیے رکھی..... یاد رہے اس الکندی نے کہا تھا ''صداقت دو مختلف سطح پر وجود رکھتی ہے۔ ایک جاہل اور ناخواندہ عوام کی سچائی

ہوتی ہے اور دوسری مہذب اور تعلیم یافتہ افراد کی.....'' از منہ وسطی کے ایک اور نابالغہ روزگار رازی کے سر پر کتاب اس وقت تک ماری جاتی رہی جب تک چوٹوں کی وجہ سے وہ اندھا نہ ہو گیا.....!! وہ اپنے وقت کا عظیم ترین طبی سائنس دان تھا۔ جب ایک ماہر بصریات نے رازی کی آنکھوں کا علاج کرنے کی پیش کش کی تو اس کا جواب تھا۔ ''میں اس دنیا کو بہت دیکھ چکا ہوں اور مجھے مزید دیکھنے کی کوئی حسرت نہیں.....'' الفارابی' ابن سینا اور ابن ھیثم جیسے روشن دماغ مفکرین پر کفر کے فتوے لگے.....ابن خلدون کو انیسویں صدی میں مغرب نے ''دریافت'' کیا کسی مسلمان کو اس کا پتہ ہی نہ تھا!

❖.....❖.....❖

سائنس اور اسلامی دنیا

آج کی اسلامی دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے بہت ہی تھوڑے ممالک کے پاس سائنسی ترقی کے منصوبے ہیں ان کا بھی زیادہ تر تعلق ملٹری پراجیکٹ کے ساتھ ہے جیسے اٹامک انرجی اور میزائل سازی وغیرہ' مسلم دنیا سستے مزدوروں اور بے ہنر محنت کشوں سے بھری ہے لیکن انھیں افرادی قوت کو ترقی (Human Development) دینے کی کوئی خاص فکر نہیں۔ اپنی ترقی کی قیمت پر کسی ہمسایہ ملک یا قوم کے ساتھ دشمنی نبھائے جانا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ اس کے لیے دشمن کا غیر مسلم ہونا بھی ضروری نہیں..... پوری اسلامی دنیا کے پاس مجموعی عالمی سائنس دانوں کا صرف ایک فیصد ہے۔ سارے اسلامی ممالک عالمی تعلیمی اخراجات کا صرف 2 فیصد خرچ کرتے ہیں لہٰذا انھیں ''غیر سائنسی ممالک'' کہا جاتا ہے جس پر انھیں کسی شرمساری کا احساس نہیں۔ اپنے ملکوں میں بے قدری' اعلیٰ تحقیقی سہولتوں کی کمی اور معمولی تنخواہیں ہونے کی وجہ سے پچھلی دو دہائیوں میں 5 لاکھ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان اپنے ملکوں کو چھوڑ کر ترقی یافتہ مغربی ممالک میں ہجرت کر چکے ہیں۔

تقریباً تمام اسلامی دنیا میں تعلیمی' ثقافتی اور سائنسی پالیسی مرتب کرتے وقت ''اسلامی اقدار'' کے تحفظ کی زنجیریں پہنا دی جاتی ہیں چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بنیادی اور خالص سائنسی علوم کی ترقی سے مسلم دنیا کی کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی وہ اپنے معاشروں میں سائنسی ذہن پیدا نہیں کرنا چاہتے لیکن زندہ تو اسی دنیا میں رہنا ہے اور حسب توفیق عیش و عشرت کی زندگی

گزارنے اور ہر ایجاد کردہ مشین کو اپنے تصرف میں لانے کی خواہش میں ہم مسلمان کسی سے کم نہیں' ظاہر ہے کہ گدھوں اور اونٹوں کی شرعی سواری استعمال کریں گے تو دنیا سے پیچھے رہ جانے کی ذلت اٹھانی پڑے گی چنانچہ مسلم ممالک بنیادی اور خالص سائنس سے اغماض برت کر صرف اطلاقی سائنسوں پر ہی زور دیتے ہیں۔ اس لیے مسلم سوسائٹی کے کسی بھی نوجوان کے سامنے سائنس کا مطلب سائنس دان بننا نہیں۔ ڈاکٹر اور انجینئر بننا ہوتا ہے۔ طب اور انجینئرنگ کن سائنسی علوم اور ریسرچ کی پیداوار ہیں انھیں اس کا کچھ پتہ نہیں یعنی ہم سائنس کے صرف ''مستری'' تیار کرتے ہیں۔ سائنسی کلچر کو ترقی دیے بغیر مغرب سے جدید مشینری خرید لیتے ہیں اور ان کے فراہم کردہ فنی لٹریچر کی مدد سے ان مشینوں کو چلانا اور مرمت کرنا سیکھتے ہیں ان میں استعمال ہونے والے میٹریل اور کل پرزوں کے لیے صنعت کار ممالک کے مسلسل دست نگر رہتے ہیں' یا پھر زیادہ سے زیادہ نقل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نہ ہمارے دماغ سائنسی ہوتے ہیں نہ خود ایجاد و دریافت کرنے کے اہل بنتے ہیں۔ خالص سائنسی فکر کی عدم موجودگی کا احساس ہماری روزمرہ بول چال میں بڑا نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ان پڑھ مریض ہو یا تعلیم یافتہ ڈاکٹر دونوں کے لبوں پر ایک ہی بات ہوتی ہے ''دعا کرو' شفا تو خدا نے دینی ہے۔ یہ علاج تو محض ایک رسم اور کوشش ہے' اس طرح خدا کی مرضی ہے انجینئروں کا بنایا پل یا سڑک سلامت رہے یا نہ رہے..... اس لیے سنگ بنیاد رکھتے وقت ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی جاتی ہے ہمارے سب کام خدائی نگرانی اور مرضی پر منحصر ہیں تو پھر سائنسی ذہنوں کی کیا ضرورت ہے یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر کا اپنے علم کے ساتھ کوئی ذہنی اور روحانی رشتہ نہیں ہوتا۔ وہ تو مغرب کے ایجاد کردہ علم طب کا مکینک ہے۔ نہ اسے فطرت کے عمل کو سمجھنے کی ضرورت ہے نہ علم طب کی تحقیق میں وہ شریک ہے۔ یہ کام کافر مغرب کرنے والے کریں۔ ہمارا ایمان' اقدار اور ثقافت سلامت رہنی چاہیے' بغیر پیندے کی سائنس پڑھائی جاتی ہے اور اس پر پیچ و تاب کھاتے ہیں کہ ہم ترقی کیوں نہیں کرتے ہم مغرب کے غلام کیوں ہیں۔ پوری اسلامی دنیا کے دانشوروں نے باجماعت فراریت کا رستہ اپنا رکھا ہے'' ساری شیطانی

امریکہ ومغرب کی ہے وہ ہمیں لوٹتے ہیں اورنہیں چاہتے کہ ہم ترقی کریں'' مسلم دنیا کی دانش کا مطالبہ ہے کہ ریسرچ اورمحنت مغرب کرے' ہم سے منافع بھی نہ کمائے اوراپنی ساری محنت اور ریسرچ کا ماحصل (ٹیکنولوجی) ہمارے قدموں میں ہماری شرائط پر رکھ جائے۔ ہم مفت کی سائنس اورٹیکنولوجی کے سارے پھل مزے سے کھائیں..... پھر ہم مغرب کو آنکھیں بھی دکھائیں۔ ہمارے معاشرتی اقدار اورنظریات بھی وہی ہیں جوصدیوں سے طے شدہ ہیں یعنی فیوڈل اورقبائلی.....!! ہمارے یہ مطالبے مغرب تو کیا خدا کے بس میں نہیں ہیں کہ اس کی طرف سے واضح اعلان ہے جتنی کوشش کروگے اتنا پاؤ گے خودنہیں بدلوگے تو کوئی نہیں بدل سکتا۔

دراصل اسلامی دنیا میں ''علم'' سے مراد مقدس متن کی نئی تشریحات تلاش کرنا ہے۔ان کا دعویٰ ہے کہ جدید سائنس نے جوبھی دریافت کیا ہے ان کی پیش گوئی مقدس آیات میں پہلے سے ہی دی جاچکی ہے چنانچہ ان کی ''علمی کاوش'' سے مراد ایسی ٹوہ میں رہنا ہے جس سے سائنسی حوالوں کو استعمال کرکے مقدس آیات کے سچا ہونے کو ثابت کیا جائے یعنی سائنس نے جو پہلے سے ہی دریافت کرلیا ہے اسے یہ پھر آیات میں ڈھونڈنے نکل پڑتے ہیں اوروہاں سے ''اسلامی سائنس'' کو باہر نکال لاتے ہیں.....اب تو آسمانی کتاب سے اتنی زیادہ ''سائنس'' باہر نکالی جا چکی ہے کہ انھیں زعم ہوگیا ہے کہ یہ مغرب کی بے دین سائنس کا خوب مقابلہ کرسکتے ہیں چنانچہ مسلم تہذیب کے زندہ ''عجائب گھر'' مملکت سعودی کی سرپرستی میں سنجیدہ کام بھی شروع ہوچکا ہے چنانچہ اس طرح کے کئی عالمی ادارے وجود میں آچکے ہیں۔مثلاً

International Institute of Islamic Thought

Scientific Miracles Conference

International Conference on Scientific Miracles of Quran and Sunnah

پاکستان میں جنرل ضیاء کے دورحکومت میں ہر چیز اسلامی قالب میں ڈھل رہی تھی چنانچہ سائنس کو بھی ''اسلامی'' بنانے کا اعلان کیا گیا۔ 1982ء کے شروع میں

(Islamisation of Knowledge) ''علم کو اسلامی بناؤ سیمینار'' منعقد کیا گیا۔ یونیورسٹی کے اس وقت کے چانسلر اے۔ کے بروہی صاحب (نظریہ ضرورت کے خالق) نے اپنے مرکزی خطاب میں ارشاد فرمایا' ''مجھے یونیورسٹیوں کی نصابی کتابوں کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ ان کے صفحات لادینی مفکروں مثلاً ڈارون' فرائڈ اور کارل مارکس کی تھیوریوں سے بھرے ہوئے ہیں'' اگرچہ بروہی کا فزکس سے کوئی تعلق نہیں تھا..... پھر بھی اسے آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت قابل اعتراض اور غیر اسلامی معلوم ہوا۔ ارشاد فرمایا' ''میری سوچی سمجھی رائے کے مطابق آئین اسٹائن کا مادے کے آخری اجزا کی حرکات کے بارے میں نظریہ اسلامی نقطہ نظر سے جھوٹا ہے'' ڈاکٹر پرویز ہود بھائی اپنی کتاب ''اسلام اور سائنس'' میں لکھتے ہیں کہ بروہی کی یہ حرکت ایسی ہی تھی جیسے ایک پادری نے بائبل کے مطالعے سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ خدا نے یہ دنیا چار ہزار سال قبل مسیح 23 اکتوبر اتوار کے روز نو بجے کے وقت بنائی تھی.....!! اب کوئی بھی سائنس دان اس پاکستانی ''پادری'' کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ صدر پاکستان کے سائنس اور ٹیکنولوجی کے مشیر ڈاکٹر ایم اے قاضی نے فرمایا۔ سائنس کو مذہب کے تابع ہونا چاہیے۔ لیجئے جناب کسی پاکستانی کو گلہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ازمنہ وسطی میں نہیں رہ رہا۔ ڈاکٹر قاضی صاحب نے ہر سطح پر سائنس کی نصابی کتب کو تبدیل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ہم جب بھی کسی سائنسی تھیوری یا اصول کو موجود دلائل اور معلومات سے ثابت کرنے کی کوشش کریں تو ہمیں اضافی طور پر قرآن اور سنت کے حوالے بھی پیش کرنے چاہیے..... چنانچہ آج پاکستانی اسکولوں کالجوں میں پڑھائی جانے والی سائنسی مضامین کی نصابی کتابوں میں پہلے ایک ایک دو دو باب اس مضمون کو اسلامی بنانے پر وقف ہیں۔ جس میں بیالوجی' کیمسٹری اور فزکس کے علم کو قرآنی آیات سے ''ثابت'' کیا ہوا ہے۔ چنانچہ ہمارا آج کا سائنس کا طالب علم نیوٹن کے قوانین کے ساتھ اس سے متعلقہ قرآنی آیات کو بھی یاد کرتا ہے' البتہ اس بات کا پتہ نہیں کہ جب نیوٹن کے قوانین دریافت نہیں ہوئے تھے اس وقت ان آیات کی کیا تشریح کی جاتی تھی.....! ہمارے ان مذہبی جوشیلوں کو پتہ نہیں ہے کہ انہی کی ذہنی سطح کے حامل ہندو بھی قدیم

مقدس ویدوں میں جدید سائنسی نظریات کی ''دریافت'' کررہے ہیں' تاؤاور بدھ مت کی تحریروں سے قوانین فزکس کے ساتھ ''حیران کن مطابقت'' مل رہی ہے۔اب پتہ نہیں مسلمانوں کو تو خدا نے بذریعہ وحی بعد میں دریافت ہونے والی صداقتیں پہلے ہی بتادی تھیں لیکن ان غیر الہامی مذاہب والوں کے اسی طرح کے دعوؤں کا کیا ہوگا۔کیا ہم کبھی جھوٹے سہاروں اور خودفریبی کے جنگل سے نکل کر عقل کی دنیا میں آسکیں گے.....؟اس ایک ملین ڈالر سوال کا جواب تو شاید کبھی نہ مل سکے لیکن مذہب اور سائنس کو ملانے میں مندرجہ ذیل مسائل اور پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

❖ سائنس کو اپنی تھیوریوں اور نظریات بدلنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی اگر نئے تجربات اور مشاہدات کسی نئے نظریے کو ثابت کردیں تو سائنس اپنے کل کے سچ کو باطل قرار دے کر نئی صداقت کو اپنا لیتی ہے۔اب اگر ہم آج کسی سائنسی نظریے کو عین ''قرآنی'' قرار دے دیں گے اور کل اگر سائنس اس سے مکر جائے.....تو پھر کیا کریں گے؟

❖ آسمانی کتب چونکہ سائنسی کتابیں نہیں ہیں۔اس میں انسان کی عمومی فکر' عامیانہ مشاہدات کو مبہم' ذومعنی اور علامتی حوالے سے بتایا ہوتا ہے۔جن کا مقصد اخلاقی سبق دینا تھا.....بیالوجی کی کلاس لگانا نہیں.....چنانچہ اس سے زمین گول ہے بھی ثابت ہوسکتی ہے اور زمین چپٹی بھی ثابت کی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی اس طرح کی نیت ہی باندھ لے.....مقدس متن کا تو کوئی قصور نہیں.....!

اگر مذہب کو سائنس سے سچا ثابت کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ احمقانہ حرکت ہوگی اس لیے کہ پھر سائنس سے مذہب کو باطل قرار دینے کی بھی سعی ہوسکتی ہے اور اس کے کامیاب ہونے کے امکانات بھی زیادہ ہوں گے.....کیونکہ سائنس کی بنیاد عقل (Reasoning) پر ہے جب کہ مذہب اپنے آخری تجزیے میں اندھا یقین ہوتا ہے گویا سائنس اور مذہب کو ملانے سے دوستی نہیں' تصادم ہوگا۔ مذہب کا وجود اور اس کی عزت اس کے ماننے والوں کے ایمان سے وابستہ ہوتی ہے۔وہی اس کی صداقت کا سب سے بڑا ثبوت ہوتے ہیں' مذہب کو اس کی حدود سے باہر نکالیں گے تو وہ متنازعہ بن جائے گا۔

دانشمندانہ رستہ یہی ہے کہ ہم سائنس اور مذہب کو ایک کہنا بند کردیں.....سچ یہی ہے ان کا

ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تفہیم کائنات کے دو الگ الگ خودمختار نظام ہیں..... جب تک دونوں ہی انسان کی مجبوری ہیں..... ہمیں ان کا اپنا اپنا پیرامیٹر متعین کر دینا چاہیے۔ مذہب جذبات کی تسکین کرتا ہے، روحانی سکون پہچاتا ہے، چند اخلاقی اسباق دیتا ہے، اس سے یہی کچھ حاصل کرنا چاہیے۔ سائنس عقل اور مادے کا میدان ہے۔ وہاں مذہب کا پیوند سوائے مسخرہ پن کے کچھ نہیں ہوسکتا۔ پرانے زمانے میں انسان کی مجبوری تھی..... کہ وہ مادی کائنات کے سوالوں کا جواب بھی مذہب سے مانگتا تھا..... آج اس کے لیے ایک مفید اور قابل بھروسہ علم سائنس کی شکل میں موجود ہے، چنانچہ مذہب کو مادی کائنات کی پیچیدگیاں سلجھانے میں استعمال کرنا غیر دانشمندانہ اور غیر مذہبی فعل ہے۔ ہم پاکستانی اس وقت تک ترقی کا بندرستہ نہیں کھول سکتے جب تک ہم سائنس اور مذہب، عقل اور عقیدے کو الگ الگ نہیں کرتے۔ ورنہ آج کے نام نہاد مسلم مفکرین خود بھی بھٹکتے رہیں گے اور اپنی قوموں کا حال اور مستقبل بھی تاریک کرتے رہیں گے۔ کبھی وہ مذہب کو عین سائنسی بنانے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی دوسرے ہی لمحے قلابازی کھا کر سائنس اور سائنس دانوں کو لادینی قرار دے دیتے ہیں۔ ''اسلامی سائنس'' کے نام پر ماضی قریب میں ایک ایسا مضحکہ خیز ڈرامہ بھی کھیلا جا چکا ہے کہ کوئی بھی ہوش مند مسلمان انگشت بدنداں رہ جائے۔ 10 اکتوبر 1987ء میں اسلام آباد کی ''انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی'' کے زیر انتظام اسلامی سائنس پر ایک کروڑ روپے سے زائد کی لاگت سے کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں دنیا بھر سے پابند شریعت ''اسلامی سائنس دانوں'' نے مندرجہ ذیل سائنسی مضامین پڑھے:

1- قرآن کی سورالنحل کی 66 آیت کے مطابق دودھ کا کیمیائی تجزیہ۔
2- قرانی طول بلد کے لحاظ سے انسان کا مقام۔
3- جن میتھین (Methane) گیس کے بنے ہوئے ہیں اس لیے ناری ہونے کے باوجود ان کا دھواں نہیں نکلتا!!
4- مصر کی مشہور اسلامی الازھر یونیورسٹی کے ایک ڈاکٹر صاحب نے اسلامی جیالوجی پر روشنی ڈالتے ہوئے تھیوری پیش کی کہ اگر زمین پر پہاڑ نہ ہوں۔ تو یہ زمین آسمانوں میں بکھر جائے! وہ مقدس متن کی تشریح فرما رہے تھے کہ پہاڑ زمین پر خدا کی گاڑی ہوئی میخیں (Nails) ہیں..... اس پر اگرچہ کسی منچلے کی آواز آئی ''خدا نے میخیں الٹی لگا رکھی ہیں!'' لیکن قانون کشش ثقل کا قصہ

بہرحال تمام ہوگیا۔

5- ایک اور مصری انجینئر نے ''ثابت'' کیا کہ آسمانوں کے ممنوعہ علاقوں میں جب کوئی جن یا انسان وارد ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو خدا ان پر تانبے کے خالی میزائیل مار کر اڑا دیتا ہے!!

6- پاکستانی سائنس اور ریسرچ کے ادارے (PCSIR) کے ایک سینئر سائنس دان نے سوسائٹی میں ''منافقت ناپنے کا ریاضیاتی فارمولہ'' ایجاد کر کے پیش کیا۔

7- پاکستان کے خلائی ادارے 'Suparco' کے چیئرین نے معراج رسولؐ کو آئین اسٹائن کی تھیوری سے سچ ثابت کرنے کے دلائل پیش کیے گو بقول ماہر فزکس ڈاکٹر پرویز وہ سب کچھ آئین اسٹائن کے نظریے کے بالکل متضاد تھا۔

8- ایک اور پاکستانی سائنس دان نے جنات کی انرجی کو استعمال کر کے ملک کی توانائی کی قلت کو دور کرنے کا قیمتی نظریہ پیش کیا!

9- جرمن سے آئے ہوئے ایک مسلم سائنس دان نے کائنات میں خدا کے زاویے (Angle of God) پر کچھ ریاضیاتی مساوات سے روشنی ڈالی! لیکن یہ صرف خدا ہی جانتا تھا کہ ان صاحب کی تھیوری کا مطلب کیا تھا۔

10- ایک پاکستانی سائنس دان نے تھیسس پیش کیا کہ ''حوریں استعمال کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہیں اور انھیں ''استعمال'' کرنے والے یا تو جن ہو سکتے ہیں یا انسان چنانچہ ثابت ہوتا ہے کہ جن اور انسان ایک جیسے ہیں''Isogeno Type'۔

کیا یہ سائنس ہے؟ لیکن بیسویں صدی کے امیر المؤمنین کے دور حکومت میں کچھ اسی طرح کی سائنس وجود میں آ رہی تھی..... جس کے اثرات پاکستان میں پڑھائی جانے والی سائنس کی نصابی کتب میں سرایت کر چکے ہیں۔ پتہ نہیں یہ مذاق سائنس کے ساتھ ہو رہا تھا یا دین کے ساتھ۔ لیکن مذہبی شدت پسندی انسان کے ہوش و ہواس اس سے بھی زیادہ اُڑا سکتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے ایک دفعہ کہا تھا کہ میں پاکستان کے ہر حکمران سے مل چکا ہوں۔ لیکن زبانی جمع خرچ کے سوا کسی کو سائنس کی ترقی میں کوئی دلچسپی نہ تھی..... ڈاکٹر عبدالسلام ''اسلام اور

سائنس‘‘میں سوال اٹھاتے ہیں۔

Is Science doomed forever in Islam?

کیا اسلامی دنیا میں سائنس کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو چکا ہے؟ اور پھر خود ہی جواب دیتے ہیں ہے کہ اس ملک میں سائنسی کلچر کا فروغ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک سیاسی ملاؤں کو کمزور کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی جاتی۔ ہمیں بنیادی سائنس دانوں کی شدید ضرورت ہے تا کہ ٹیکنالوجی کے اطلاقی سائنس دانوں کے لیے وہ پوائنٹ آف ریفرنس بن سکیں۔ ہمیں ایسے سائنسی افراد کی ضرورت ہے۔ جنھیں ریاست تمام سہولتیں بہم پہنچائے اور وہ تحقیق کے لیے اپنی کمیونٹیاں بنائیں اور تحقیق کے اپنے اپنے طریقہ ہائے کار کو خود ترقی دیں‘ ان کا عالمی سائنس دانوں سے بھی قریبی تعلق ہونا چاہیے تا کہ مسلم دنیا سے باہر سائنس اور ٹیکنالوجی کا معیار ان کی نظروں کے سامنے ہے لیکن اس ملاّ کیا کیا جائے جو ہر مسلم ذہن کے اندر براجمان ہے اس سے قطع نظر کہ وہ تعلیم یافتہ ہے یا ناخواندہ.....

❖.....❖.....❖

نصاب تعلیم اور دینیات

اس بات پر عمومی اتفاق رائے ہوسکتا ہے کہ تعلیم کا مقصد فقط کسی فرد کو خواندہ بنانا یا اسے اپنی روٹی روزی بہتر طور پر کمانے کے قابل کرنا ہی نہیں ہونا چاہیے۔ تعلیم انسان کی فکری، تمدنی، تہذیبی اور مادی ترقی میں ایک زبردست نہایت گہرا اور کثیر الجہتی کردار ادا کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تعلیم سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ انسان کی شخصیت کو خوبصورت بنائے اس کی تخلیقی قوتوں کو اجاگر اور فکر کو روشن کرے۔ اب دنیا کا کوئی فلسفی یا سائنس دان ایسا پیدا نہیں ہوسکا جس نے یہ کہا یا ثابت کر سکا ہو کہ مطلوبہ نتائج قدغن فکر سے اور یک رخے پہلو کو مطلق صداقت کے طور پر پیش کر کے بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ دماغ کا پھول آزاد فکری کے ماحول میں ہی کھل سکتا ہے اگر اسے ابتدا سے ہی عقائد، نظریات، اقدار اور تعصّبات کی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے تو لاکھ تعلیم کے رسمی درجات طے کر لیے جائیں..... علم کی روح سے خالی پڑھے لکھے جہلا ہی پیدا ہوں گے۔

آزادی، فکر کی فضا سے محروم تعلیمی عمل شخصیت میں بے شمار پیچیدگیاں پیدا کر سکتا ہے۔ اولاً ذہانت میں اضافہ نہیں ہوگا جو تعلیم کا بنیادی مقصد ہے۔ دوسرے آپ صرف نقال بن جائیں گے۔ علم اور ٹیکنالوجی کو خود تخلیق کرنے سے قاصر رہیں گے۔ تیسرے آپ دوہری شخصیت کا شکار ہو جائیں گے۔ ایک طرف جدید دنیا کی چمک اپنی طرف کھینچے گی دوسری طرف قدامت پرستی پاؤں کی زنجیر بنی ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ معاشرہ خود سے ہی برسرِ پیکار ہو جائے گا۔ یہ وہ صورت

حال ہے جس سے ہمارا معاشرہ اور ملک گزر رہا ہے.....لیکن ایسا کیوں ہو رہا ہے۔اس کے لیے جرات مندانہ تجزیے اور خود تنقیدی کی ضرورت ہے۔ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا..... کہ بحیثیت قوم ہم چاہتے کیا ہیں۔کیا ہم ایک جدید مہذب ریاست کے زیر سایہ ترقی یافتہ صنعتی قوم بننا چاہتے ہیں یا صدیوں پرانے کسی قبائلی، نیم فیوڈل اور ناخواندہ معاشرے کی ''پاکیزہ اخلاق واقدار'' کو گلے لگائے رکھنا چاہتے ہیں۔اگر معاملہ ایسا ہے تو پھر ہمیں ترقی یافتہ قوموں کی غلامی اور اپنی اقتصادی پس ماندگی پر کوئی پیچ وتاب نہیں کھانا چاہیے۔تاریخی قوانین اس بات کی نفی کرتے ہیں کہ معاشرہ تو ترقی یافتہ ہو لیکن اس کے نظریات اور اقدار صدیوں پرانے کسی بوسیدہ معاشرے سے متعلق ہوں۔ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ ''دین دار'' اور ''اخلاقیات'' کی علمبردار قوموں کے مقدر میں سیاسی اور اقتصادی پس ماندگی کیوں لازمی طور پر لکھی ہے۔

تاریخ کو دیکھا جائے تو تعلیم اور مذہب دونوں اکٹھے شروع ہوئے تھے۔یہ مابعد الطبعیات ہی تھی جس نے تعلیمی تصور کو جنم دیا۔اس زندگی اور کائنات کے بارے میں غور وفکر کرنے کے عمل میں جو بھی تصور کائنات پیدا ہوئے انھیں اگلی نسلوں تک منتقل کرنے میں تعلیم نے گاڑی کا کردار ادا کیا۔چنانچہ اولین دور کی تعلیم صرف مذہب کی ہی تعلیم ہوا کرتی تھی اور لکھنے پڑھنے پر مذہبی پیشواؤں کا اجارہ تھا۔پھر تہذیب وتمدن کے ارتقاء کے ساتھ دنیاوی علوم (سیکولر) تعلیمی نصاب کا حصہ بننے لگے۔انسان کے عمل اور سوچ کے دائرے وسیع ہوئے تو دنیاوی علوم کیفیتی اور کمیتی لحاظ سے علم الٰہیات سے سبقت لے گئے۔علم الٰہیات کا دائرہ محدود تھا۔وہ ایک حد تک ہی ترقی پا سکتی تھی بلکہ تاریخ کے ایک مقام پر اس نے خود اپنے ''آخری'' ہونے کا اعلان کر دیا کہ مزید اس میں کسی اضافے کی گنجائش باقی نہ رہی تھی..... جب کہ دنیاوی علوم اپنے غیر محدود ترقی وارتقاء کرتے رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔نت نئے علوم ایجاد ہوتے رہیں گے جو انسان کی کائنات پر گرفت کو بڑھاتے رہیں گے۔

دنیاوی و مادی علوم نے کائنات کے بارے میں انسان کی آگاہی میں ایسے اضافے

کیے کہ علم الٰہیات کے دائرہ کار میں آنے والے موضوعات بھی سائنسی علوم کے انکشافات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انسان نے ان موضوعات پر علم الٰہیات کی راہنمائی کے بغیر سوچنا شروع کر دیا..... چنانچہ غیر سائنسی علوم یعنی سوشیالوجی' فلسفہ و نفسیات' اقتصادیات' تاریخ' اخلاقیات اور فنون و جمالیات سبھی نے علم الٰہیات سے خودمختار حیثیت اختیار کر لی.....جن کا منبع انسان کے مشاہدات و تجربات اور سائنسی دریافتوں پر مبنی حقائق بنے۔ چنانچہ آج کسی کے لیے یہ دعویٰ کرنا بڑی خودستائی ہوگی..... کہ علم الٰہیات انسان کے تمدنی اور معاشرتی مسائل کا کوئی ایسا مثالی حل پیش کرتا ہے جو اور طرح کے مسائل کو جنم نہ دیتا ہو۔ ایسا اس وقت بھی نہیں ہوا تھا جب انسان کے فکر و حیات پر علم الٰہیات کا مکمل قبضہ تھا۔ انسانی معاشرہ ہمیشہ مسائل اور تضادات کے ٹکراؤ کا شکار رہا ہے۔ متضاد قوتیں اور نظریات برسرپیکار رہے ہیں اور انھیں میں سے انسان آگے بڑھنے کی راہ نکالتا آ رہا ہے۔ آئیڈیل ناقابل حصول چیز کا نام ہے اور خود کو آئیڈیل اور تمام مسائل کا حل قرار دینے والا نظریہ اپنے ناقص ہونے کا خود اعلان کر رہا ہوتا ہے' دنیا میں آئیڈیل معاشرہ نہ کبھی پیدا ہوا تھا' نہ کبھی ہوسکتا ہے چنانچہ ایک ہی حل باقی رہ جاتا ہے کہ موجود معاشرے کے مسائل کو اپنے زماں و مکاں کے تناظر میں یوں حل کرنے کی کوشش کی جائے جس سے انسان کی فکری اور مادی ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان اور معاشرے کو آزادانہ سوچنے سمجھنے کی اجازت دی جائے اور انھیں اپنے فیصلے خود کرنے کا اختیار حاصل ہو.....لیکن ہمارے معاشرے میں انسان کے فکر و عمل کو بچپن سے ہی محدود کر دیا جاتا ہے۔ اسے بہت چھوٹی عمر میں ہی مذہب کے نام پر ایک متعصب نقطہ نظر دے دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ پھر کبھی باہر نہیں نکل سکتا' چنانچہ معاشرہ ترقی وارتقاء کے عمل سے یا تو محروم رہتا ہے یا یہ عمل نہایت سست رو ہو جاتا ہے۔ علم کی کمی انسان کو جذباتی بناتی ہے اور کون نہیں جانتا کہ ہم ایک جذباتی قوم ہیں۔ ہم جذبات کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہمیں دوسروں کو اور خاص طور پر آنے والی نسلوں کو ''نیک'' بنانے کا وہم کی حد تک شوق ہے اس لیے ہم نے اپنے نصاب تعلیم میں دینیات کا مضمون

نرسری سے لے کر یونیورسٹی کی اعلیٰ سطحی تعلیم تک لازمی قرار دے رکھا ہے۔

اگر فلسفہ تعلیم اور تعلیم کے مقاصد کو سامنے رکھیں تو نصاب تعلیم میں دینیات پر زور دینے سے معکوس نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ تعلیم Counter Productive بن جاتی ہے اور ان مقاصد کا ہی قتل ہو جاتا ہے جن کے لیے تعلیم دی جا رہی ہوتی ہے۔ دینیات کے مضمون پر زور دیں گے تو مندرجہ ذیل منفی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

(i) مذہبی تعلیم کی وجہ سے طالب علم کے اندر آزادی فکر کا بیج نہیں پھوٹ سکے گا۔ وہ زندگی اور کائنات کے یک طرفہ اور محدود نقطہ نظر میں بند ہو کر رہ جائے گا۔ عقیدہ کوئی بھی ہو اس کی اساس دوسروں کو غلط اور خود کو اعلیٰ (Superior) کہنے پر ہوتی ہے۔ جب کہ تعلیم کا مقصد ذہن کی ایسی تربیت کرنا ہے جس سے وہ آزادانہ اور تمام متعلقہ عوامل کو سامنے رکھتے ہوئے سوچ سکے۔ تعلیم یافتہ ذہن کی ماضی پر بھی نظر ہوتی ہے۔ آزادانہ فکر و سوچ کا حامل انسان ہی صحیح رائے قائم کر سکتا ہے اور علم کے خزانے کو آگے بڑھا سکتا ہے۔

(ii) مذہبی تعلیم پر زور دینے سے فرقہ پرستی اور کٹر پسندی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اذہان تنگ دائرے میں بند ہو جاتے ہیں ایسے بند ذہن معاشرے کی ترقی و ارتقاء کے لیے خطرناک بن جاتے ہیں کیونکہ مذہب کی بنیاد پر وہ خود کو حق پر سمجھنے لگتے ہیں، چنانچہ دوسروں پر زور آوری کرنا ان کے نزدیک کارِ ثواب ہو جاتا ہے جب کہ تعلیم کا مقصد ایک غیر متعصب اور انسانیت ساز ذہن پیدا کرنا ہے۔ عقیدہ جارحانہ طبیعت پیدا کرتا ہے۔

(iii) ضرورت سے زیادہ مذہبی لگاؤ سائنسی انداز فکر کو پنپنے سے روکتا ہے۔ سائنس کے پیریڈ میں قوانین فطرت پڑھائے جاتے ہیں۔ چیزوں کو ارتقائی تسلسل میں دیکھنے کو کہا جاتا ہے جب کہ دوسرے ہی لمحے دینیات کے پریڈ میں مقدس ہستیوں کے ہاتھوں انہی قوانین فطرت کو ایک اشارے سے الٹے پلٹتے ہوتے بتایا جاتا ہے اور ایک ایسا عقیدۂ تخلیق دیا جاتا ہے جس سے اس دنیا کے سب جمادات، نباتات اور حیوانات کسی وقت معین پر آناً ''فاناً'' اپنی موجودہ شکل میں

تخلیق پا گئے تھے.....ایسے میں طالب علموں کے اندر سائنسی انداز فکر کیسے پیدا ہوسکتا ہے چونکہ نوجوان مذہب کو شک کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا اس لیے وہ سائنس کو شک کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے یا کم از کم سائنسی فکر اس کے شعور کی گہرائیوں میں نہیں اتر پاتی.....اس لیے ہمارے ذہن سائنسی نہیں بن پاتے ہم سائنس کی ایجاد کردہ مشینوں کے آپریٹر ہی ہو سکتے ہیں۔ بنیادی طور پر ہماری سوچ سائنس شکن ہی رہتی ہے۔ایسا نظام تعلیم ہمیں کئی ہزار سال تک مغرب کی اقتصادی صنعتی غلامی سے نجات نہیں دلا سکتا اور یاد رکھنا چاہیے کہ اقتصادی اور صنعتی غلامی، سیاسی اور روحانی غلامی پر منتج ہوتی ہے۔سائنسی فکر کے بغیر تعلیم یافتہ اور جاہل میں فرق صرف خواندگی کا ہی رہ جاتا ہے۔

(iv) مذہبی تعلیم پر ضرورت سے زیادہ زور خود مذہبی تعلیم کی افادیت کا ہی خاتمہ کر دیتا ہے۔ مذہب، مخصوص تاریخ اور دیومالائی قصوں، بندھے ٹکے عقائد اور اخلاقیات کے لیکچر پر مشتمل ہوتا ہے جن کی بار بار تکرار مثبت نتائج پیدا نہیں کرتی.....لوگ بور ہونے اور اس سے الجھن محسوس کرنے لگ جاتے ہیں اور چونکہ دینیات کی یہ سب باتیں موجودہ زندگی کے مسائل اور وقت کی حقیقتوں کے سیاق و سباق میں نہیں ہوتیں چنانچہ ان کے ساتھ فطری دلچسپی بھی پیدا نہیں ہو پاتی.....دیکھا یہی گیا ہے مذہبی تعلیم اپنے منفی اثرات تو لوگوں کے ذہنوں پر ثبت کر جاتی ہے لیکن دعویٰ کے مطابق مثبت اثرات نظر نہیں آتے۔ مذہب نے کردار سازی کی بجائے ثواب کاری کا ذریعہ بن جانا ہوتا ہے اور طلباء کو یہ مضمون اس لیے بھی بور لگتا ہے کہ انھیں مستقبل کی عملی زندگی میں اس کا کوئی رول نظر نہیں آتا کہ وہ ان مضامین کو چھوڑ کر جنھیں نے مستقبل میں کام آنا ہے ایک ایسے مضمون پر وقت صرف کریں جس کی ایک تو عملی افادیت کوئی نہیں اور دوسرے وہ سب باتیں پہلے سے ہی کئی بار سنی اور پڑھی ہوتی ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا نصاب میں مذہب کی تعلیم شامل ہونی چاہیے؟ اس سوال پر بحث کرنے سے پہلے اس بات کی یاد دہانی کرادی جائے کہ برسوں پہلے ہمارے ہاں دینیات کا

مضمون ''اختیاری'' ہوا کرتا تھا لیکن اب یہ مضمون نرسری سے لے کر یونیورسٹی کی اعلیٰ پیشہ ورانہ تعلیم تک ''لازمی'' حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے پالیسی سازوں کو قوم کو ''نیک'' بنانے کا خیال کیونکر آیا۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ ہمارے ہاں یا تو ایسے حکمران آئے جو تاریخ کے قوانین اور عوام سے اپنی رشتہ استوار نہ رکھنے کی وجہ سے ملائیت کی چھوٹی سی اقلیت کے ہاتھوں بلیک میل ہوئے یا ایسے آمر آئے جن کا مقصد ہی عوام کو جہالت کے اندھیروں میں ڈالے رکھنا تھا یا پھر ایک مشہور مذہبی سیاسی جماعت نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت تعلیمی بیوروکریسی میں اپنے کارندے شامل کر کے نصاب میں اپنی مرضی کی تبدیلیاں کروائیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کیا نصاب میں مذہب کی تعلیم شامل ہونی چاہیے؟ عصر حاضر کے ایک مفکر تعلیم پال ہرسٹ (Paul Hirst) کا کہنا ہے ''اس نظریے کی طرف دیکھیئے کہ مذہب علم کی شکل نہیں' لہٰذا ریاستی فنڈ سے چلنے والے اسکولوں کے نصاب (Curriculum) میں دینیات کے مضمون کی کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔'' سیدھی سی بات ہے اسکولوں کا مطلب عقائد دینا نہیں علم دینا ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی کو مذہبی تعلیم حاصل کرنی ہے تو اس کے لیے الگ سے اسکول ہونے چاہیئے' جس کا دل چاہے دینیات کی تعلیم اپنے اپنے عقائد کے مطابق حاصل کرے۔ دینیات کی تعلیم حاصل کرنے پر کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے لیکن سب کو زبردستی مذہبی تعلیم دینا جدید زمانے کے تقاضوں کے منافی ہے اور اگر اپنے شہریوں کو ایک طرح کا عقیدہ پڑھانا ہے تو دوسری طرح کے عقائد رکھنے والے شہریوں کے بھی عقائد سرکاری اسکولوں میں پڑھانے ہوں گے۔ ویسے ہمارے ہاں دو اسلامیات (شیعہ اور سنی) پہلے سی چل رہی ہیں..... آئین کے تحت بلا مذہب وعقیدہ سب شہری برابر ہیں تو پھر دوسرے عقائد اور مذاہب رکھنے والوں کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے کا کیا قانونی اور اخلاقی جواز ہے۔ ہمارے ہاں انسانی اور اخلاقی حقوق کی پامالی کا یہ عالم ہے کہ غیر مسلموں کو بھی اسلامیات پڑھا دی جاتی ہے۔

ماہرین مذہبی تعلیم کو دو طرح سے تقسیم کرتے ہیں (i) مذہب کے متعلق

تعلیم (Education about Religion) اور (ii) مذہب کی تعلیم (Education in Religion)' مذہب کے متعلق' تعلیم میں طلباء کو بتایا جاتا ہے کہ ماورائے فطرت کے بارے میں فلاں عقائد فلاں لوگ رکھتے ہیں اور ان عقائد نے اس قوم کے ادب' آرٹ' سیاسی تصادموں' سماجی ابھاروں اور ان کے تاریخی دھارے پر فلاں فلاں اثرات مرتب کیے۔

مذہب کی تعلیم' میں طلباء کو بتایا جاتا ہے کہ کس طرح مذہبی سوالات اور جوابات کی دوسری طرح کے سوالات و جوابات سے تفریق کی جاتی ہے۔ ایک شخص خود کو مذہبی معنوں میں کس طرح دیکھتا ہے اور مذہبی لگاؤ' اس کی سوچ اور قوت فیصلہ (Judgments) پر کس کس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔

مذہب کی تعلیم دیتے وقت ہمیں ایک اور بات کا بھی فرق رکھنا ہوگا کہ ہم طلباء کو مذہب میں تعلیم یافتہ (Educated in Religion) کرنا چاہتے ہیں یا انھیں مذہبی شخص بنانا مقصود ہے۔ اگر دوسری بات ہے تو پھر وہ تعلیم نہیں رہے گی۔ تبلیغ بن جائے گی۔ دینیات کے استاد کا کام یہ ہے کہ وہ طلباء کو مذہبی طور پر تعلیم یافتہ کرے' انھیں مذہب کے بارے میں غیر متعصب طریقے سے معلومات پہنچائے۔ اس کا کام طلباء کو مذہبی بنانا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ دینیات کے استاد کو مبلغ (Preacher) کا درجہ نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ایسا کرنا تعلیم کی روح کے منافی ہوگا..... معلم اور مبلغ میں فرق ہونا چاہیے۔ مذہب کی تعلیم پا کر طلبہ خود فیصلہ کریں گے کہ انھوں نے اسے عملی زندگی میں کس طرح کا اور کیا مقام دینا ہے۔ ہمیں عقیدے اور تعلیم کے فرق کو سمجھنا چاہیے' تعلیم کی ایک تعریف کے مطابق "Initiation into various kinds of understanding" ہے یعنی مختلف النوع کی تفہیم میں باضابطہ شرکت کا نام تعلیم ہے جب کہ عقیدے میں مختلف النوع کی تفہیم کی اجازت نہیں ہوتی..... اور اگر اسکولوں میں مذہب کو عقیدے کے طور پر پڑھانا ہے پھر وہ مذہب کی تعلیم نہیں رہے گی تبلیغ بن جائے گی۔ تعلیم کے پراسس میں اساتذہ کا وجود اس لیے ہوتا ہے کہ وہ طلبا کو سیاق و سباق فراہم کر دیں جس پر طلبا اپنی

ذہانت اور معقولیت (Rationality) کو آزما سکیں۔

یہ کسی بھی سوسائٹی کا جائز حق ہے کہ وہ اپنی شناخت کے تسلسل کو برقرار رکھے اور ساتھ ہی بدلتی دنیا کے مطابق خود کو ڈھالتی چلی جائے.....جس کے اندر اسے زندہ رہنا ہے لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم بحیثیت قوم مذہبی شناخت اور بدلتی دنیا کے تقاضوں کے درمیان تناسب رکھنے کا گر نہیں سیکھ سکے۔ جب ہمیں مذہب کا ''دورہ'' پڑتا ہے تو ہم سرپٹ چودہ سو سال پہلے والے ایک پسماندہ، قدیم قبائلی معاشرے کی اقدار کی طرف دوڑ لگا دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم ایک نہایت تیزی سے بدلتے، سمٹتے جدید ترقی یافتہ سائنسی معاشرے میں زندہ ہیں۔ ایک زندہ معاشرہ اپنے نوجوان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کی زبان، ادب، تاریخ، روایات کو اچھی طرح سمجھے جن کی وجہ سے اسے ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے اور ساتھ ہی بقا اور ترقی کے لیے جدید سائنسی اور تکنیکی تقاضوں کے ساتھ بھی چلے کیونکہ معاشرے کے پیش نظر اہم ترین چیز حال اور مستقبل کی فلاح و بہبود ہونی چاہیے۔

مذہبی تعلیم کے حوالے سے اس وقت ایک دلچسپ پہلو سامنے آیا جب ایک مغربی ملک میں لوگوں سے ان کی رائے پوچھی گئی تو اکثریت نے مذہبی تعلیم دینے کی حمایت کی حالانکہ اس معاشرے کے صرف دس فیصد لوگ ہی عبادت گاہوں میں جاتے تھے۔ کیا یہ عوام کی غیر معقولیت اور منافقت کی کلاسیک مثال ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے جو لوگ اپنی زندگی میں مذہب کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔ وہ بڑے خلوص سے چاہتے ہیں کہ ان کے بچوں کو مذہب کی تعلیم دی جانی چاہیے.....دراصل ہمارے لاشعور میں ایک خواہش ایسی بیٹھی ہے جو انسان کو شریف النفس بنے دیکھنا چاہتی ہے جب کہ زندگی کی عملی حقیقتیں اور مفادات کا ٹکراؤ اسے ایسے مثالی کردار میں ڈھلنے سے روکتے ہیں۔ عام آدمی اس سارے پیچیدہ عمل کو نہ سمجھ سکتا ہے نہ ہی وہ اس چکر میں پڑنا چاہتا ہے چنانچہ جو وہ خود نہیں کر سکا (نہ کوئی کر سکتا ہے) وہ خواہش رکھتا ہے کہ آنے والی نسلیں، مثالی شرافت کا روپ دھار لیں اس لیے اس کی شارٹ کٹ راہ کے طور پر اسے مذہب ہی نظر آتا ہے۔

اس لیے کہ مذہب کو ہمیشہ مثالی بنا کر پیش کیا جاتا ہے مزید برآں ہر مذہب کے ماننے والوں نے دور ماضی کا کوئی سنہرا اور مثالی دور اپنے ذہنوں میں بسا رکھا ہوتا ہے جس کا حقیقی تاریخ میں کوئی ثبوت نہیں ملتا.....اس زمین پر کبھی بھی ایسا معاشرہ تشکیل نہیں پایا۔ جب انسان فرشتے بن گئے ہوں۔ ''سنہرے سے سنہرے دور'' میں بھی باہمی رقابتوں اور مفادات کے ٹکراؤ کا عمل جاری رہا ہے دراصل انسانی سائیکی کے دو پہلو ہیں۔اس کا ایک حصہ مضطرب مزاج ہے۔وہ ہمیشہ بے چین رہتا ہے۔تبدیلی چاہتا ہے جب کہ دوسرا حصہ سکوت پسند ہے' شانتی چاہتا ہے' ٹھہراؤ اور سکون مانگتا ہے۔عملی زندگی کی نہ ختم ہونے والی تگ ودو میں مصروف بالغ معاشرہ جب آنے والی نسل کے لیے مذہبی تعلیم کا مطالبہ کرتا ہے تو دراصل وہ چاہ رہا ہوتا ہے کہ جو سکون انھیں میسر نہیں آیا شاید اسے آنے والی نسلیں حاصل کر پائیں.....لیکن یہ سارا خود فریبی کا کھیل ہے۔نوجوان نسل نے خواہ کتنی ہی مذہبی تعلیم حاصل کی ہو.....عملی زندگی میں اسے روحانی سکون کی نہیں..... مادی احتیاجات کی ضرورت ہوگی..... چنانچہ وہ بھی سکون سے اتنی ہی دور رہے گی جتنی سابقہ بالغ نسل.....ہم مانیں یا نہ مانیں مذہب عملی زندگی کا مکمل طور پر احاطہ نہیں کرسکتا.....اس لیے وہ ہمیشہ پارٹ ٹائم حصول ثواب تک محدود رہ جاتا ہے۔ باقی زندگی کا سارا کھیل مفادات کی تنی رسی پر چل کر کھیلا جاتا ہے۔

دینیات کے استادوں کا یہ شکوہ بڑا پرانا ہے کہ طلباء دینیات کو ایک بور مضمون سمجھتے ہیں۔ان کے لیے یہی سخت ترین کام ہے کہ وہ کس طرح اس مضمون میں طلبا کی دلچسپی پیدا کریں تا کہ وہ اس مضمون کو بھی سنجیدگی سے پڑھیں اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ مادہ پرستی بڑھ گئی ہے اس لیے نوجوانوں کی مذہب سے دلچسپی نہیں رہی۔اگر حقائق زندگی یہی ہیں تو ہم اسے قبول کیوں نہیں کرتے۔مشاہدے کی بات ہے طلبا کو اگر دینیات کے پریڈ میں اپنی مرضی سے بیٹھنے کی آزادی دی جائے تو 90 فیصد طلباء کلاس سے اٹھ کر چلے جائیں۔

طلباء کی اس مضمون میں بوریت کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں۔

(i) اس مضمون میں ایک ہی مواد کی بار بار تکرار کی جاتی ہے' کوئی نئی بات سامنے نہیں آتی۔

(ii) دینیات ایک یک طرفہ مضمون ہوتا ہے اس میں صرف سننا ہوتا ہے جو کچھ کہا جا رہا ہوتا ہے اس پر نہ کسی سوال کی اجازت ہوتی ہے نہ اس میں غور وفکر کرنے کی کوئی گنجائش..... کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کی تصدیق وتحقیق ہی کر لی جائے چونکہ طلباء اس مضمون میں خود کو شریک نہیں کر سکتے لہٰذا وہ بوریت محسوس کرتے ہیں۔

(iii) چونکہ اس میں عملی زندگی کے سیاق وسباق کے بغیر پند ونصائح ہوتے ہیں۔ نیکی و پرہیز گاری کی بڑی بڑی باتیں ہوتی ہیں جو عملی زندگی میں کہیں نظر نہیں آتیں چنانچہ طلباء اسے ایسا مضمون سمجھنے لگتے ہیں جس کا زندگی کی حقیقتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

(iv) مذہب چونکہ بطور عقیدہ سامنے آتا ہے جسے ہر فرد کو پیدائشی طور پر مان لینا ہوتا ہے تو طلباء نفسیاتی طور پر سوچتے ہیں کہ اسے جب سچا مان لیا ہے تو پھر بار بار تکرار کے کیا معنی؟.....

ماہرین تعلیم کے سامنے پھر یہ سوال آیا کہ کچھ اور بھی تو مضمون ایسے ہو سکتے ہیں جنھیں طلباء غیر دلچسپ اور بے وقعت سمجھتے ہوں کیا انھیں ترک کیا جا سکتا ہے تو یہ بات واضح ہوئی کہ معاشرہ اگر دینیات پڑھانا ضروری سمجھتا ہے تو پھر اس کا انداز دلچسپ اور معروضی ہونا چاہیے تا کہ وہ عقائد کا پلندہ نہ بنے بلکہ زندگی اور کائنات کو سمجھنے کا ایک مختلف انداز فکر ہو جسے فلسفہ وحکمت کے رنگ میں رنگا جا سکے..... دینیات کی پڑھائی میں عقلیت کا دامن نہیں چھوٹنا چاہیے۔ دوسری بات جو ہمارے اپنے حوالے سے نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ بہت چھوٹی عمر کے بچوں کو مذہبی تعلیم دینا' جدید سائنسی نظریات کے منافی ہے' ماہرین تعلیم ونفسیات کا کہنا ہے کہ مذہب مابعد اطبیعیاتی اور تجریدی مسائل پر مبنی ہوتا ہے جو بچے کی فہم وفراست سے بالاتر ہوتے ہیں۔ بچہ ان کا رٹا لگا لے گا اور بلا سوچے سمجھے وہ انھیں اٹھائے پھرے گا۔ چھوٹی سی عمر میں بچے پر عقائد کی بھرمار اس کے ذہن کی نشوونما کو روک دے گی اور اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جائیں گی۔ چھوٹی عمر کے بچوں کو وہ چیزیں بتانی اور سکھانی ہوتی ہیں جو اس کے آس پاس ہوتی ہیں..... یہ ذہنی تشدد

کے مترادف ہے کہ بچے کو آسمان سے پرے لے جایا جائے اور وہاں کی باتیں بتائی جائیں.....وہ ثواب و گناہ، پاک و ناپاک، کفر و ایمان، مقدس اور غیر مقدس جیسی تجریدی اصطلاحوں کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے اور اس عمر میں یہ باتیں اس کا مسئلہ بھی نہیں ہوتیں۔ یہ بالغ معاشرے کی کم نگاہی کی دلیل ہے جو بچوں کی معصومیت کا ناجائز فائدہ اٹھائے اور نہایت کچی عمر میں ان پر ایسے عقائد کو ٹھونس دے جن کی انھیں کچھ خبر نہیں.....اگر ہم واقعی تعلیم کے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اور سوچنے سمجھنے والی نسلیں پیدا کرنا چاہتے ہیں تو پھر پرائمری تعلیم سے ہمیں دینیات کے مضمون کا خاتمہ کر دینا چاہیے اور اس کی بجائے سیدھی سادھی اخلاقیات پڑھائی جانی چاہیے جس کا تعلق ان کی عمر سے ہوتا کہ عقائد میں منقسم ہونے سے پہلے بچوں پر مشترک انسانیت کا رشتہ واضح ہو جائے۔ جہاں تک اپنے مذہب سے تعارف کا تعلق ہے وہ انھیں غیر رسمی طور پر اپنے ماحول اور گھر سے ہو جائے گا البتہ ایلیمنٹری اور ثانوی تعلیم کے دوران اسے ایک باقاعدہ مضمون کی شکل میں داخل کیا جا سکتا ہے اور جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اس کا مطلب بھی مذہبی بنانا نہیں بلکہ مذہب کی تعلیم دینا ہونا چاہیے۔

چھوٹے چھوٹے بچوں کے دینیات کے نصاب میں ہم نے لمبے لمبے مقدس متن زبانی یاد کرنے کے لیے رکھے ہوئے ہیں اس سے دو رس منفی نتائج نکلتے ہیں، بچوں کو رٹا لگانے کی عادت پڑ جاتی ہے وہ دیگر مضامین کے سوالوں کا بھی بلا سوچے سمجھے رٹا لگا لیتے ہیں اور ٹیچر کے حکم پر ہاتھ باندھے، آنکھیں بند کیں اور دینیات کی سورتوں کی طرح فر فر سنا دیا اور ٹیچر صاحبان خوش کہ بچے نے کیا رٹا لگایا ہے..... پھر بچوں کی دینیات میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ خدا نے زمین، چاند، سورج، ستارے بنائے، درخت اس نے بنائے، پھول پودے اس نے اگائے.....پہلی بات تو یہ ہے کہ اس وقت بچوں کا یہ مسئلہ نہیں ہوتا کہ جو چیزیں نظر آ رہی ہیں وہ کس نے بنائی ہیں اور نہ ہی خدا نے بنائی ہیں والی بات کو وہ سمجھ سکتا ہے۔ البتہ اس کا منفی اثر یہ ضرور ہوگا کہ دنیا کی سب چیزیں بنی بنائی ہیں اور کسی خدا نامی غائب ہستی نے بنائی ہیں۔ اس کے بعد جب سائنس اسے یہ بتائے گی کہ وہ

چیز ارتقائی مراحل سے بنی ہے اور تخلیق کا عمل مسلسل جاری ہے۔ تو وہ اسے کبھی بھی قبول نہیں کرے گا۔ لہٰذا سائنس پڑھنے کے بعد بھی اس کی فکر غیر سائنسی بن کر رہ جائے گی۔ اسی طرح یونیورسٹی کی سطح تک دینیات (Theology) کے الگ شعبے کے سوا کسی اور شعبے کے نصاب میں اس مضمون کی شمولیت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس کا صرف ایک ہی مطلب نکلتا ہے کہ معاشرے کے نوجوان جب خود کو عملی زندگی میں داخل ہونے کے لیے پیشہ ورانہ اور خصوصی (Specialised) تعلیم حاصل کر رہے ہوں تو ان کی توجہ بٹا دی جائے وہ نہ دین کے رہیں اور نہ دنیا کے۔ ہمارا بالغ معاشرہ ایسے ہی نمونے کی تصویر ہے۔ جوان نسل کو دین اور دنیا کا ملغوبہ دیں گے تو ان کے سامنے نہ کوئی رستہ واضح ہوگا نہ کوئی سوال۔ کرپٹ ہونے کے سوا کوئی راہ باقی نہ بچے گی۔

❖.....❖.....❖

کیا نیکی پڑھائی جاسکتی ہے؟

اس سوال پر غور کرنا اس لیے ضروری ہے کیونکہ ہمارے ہاں دینیات نرسری سے لے کر یونیورسٹی تک لازمی پڑھانے کے پیچھے نوجوان نسل کو ''نیک'' بنانا مقصود قرار دیا جاتا ہے۔ اسی ملک میں جب کبھی یہ مضمون اختیاری تھا تو کیا اس وقت نیک لوگوں کی تعداد قلیل تھی اور جب سے یہ مضمون لازمی قرار پایا ہے تو کیا سبھی پڑھے لکھے لوگ نیک ہو گئے ہیں؟ اور اگر حقائق اس سے برعکس ہیں تو پھر اس مضمون پر نوجوان نسل کی پڑھائی کے کروڑوں گھنٹے صرف کروانے پر بضد کیوں ہیں؟ آیئے اس سوال پر ذرا تفصیلاً بحث کرتے ہیں۔

تاریخ میں سب سے پہلے افلاطون نے اپنے ابتدائی مکالموں میں یہ سوال اٹھایا تھا' ''کیا نیکی پڑھائی جاسکتی ہے؟'' سقراط بھی اس سوال پر اٹک گیا تھا کہ ریاضیات' جیومیٹری' فلکیات' قانون دانی' پہلوانی' اور طب وغیرہ کے سبھی مضمون پڑھائے جاسکتے ہیں اور ان کے پیشہ ورانہ اساتذہ بھی مل جاتے ہیں مثلاً آپ کو انجینئر بننا ہو' تیراکی سیکھنی ہو یا نشانہ بازی تو آپ کو ماہر سے اسباق لینے پڑیں گے اور اگر آپ محنتی ہوں گے اور طبعی رجحان بھی ہوگا تو آپ یہ سب کچھ بن بھی جائیں گے۔ لیکن جب کوئی شخص اچھا انسان بننا چاہے تو اس کے لیے کوئی ایسا ''ٹیکنیکل'' کالج موجود نہیں۔ جہاں شرافت اور نیکی پڑھائی جاتی ہو' اسکولوں نے بھی چند ''پیریڈ'' اپنے ٹائم ٹیبل میں ایسے نہیں رکھے ہوتے کہ بے غرضی کے لیے کلاسیں مختص ہوں۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کالج بھی راست بازی اور بے طمعی (Ungreediness) کا ڈگری پروگرام آفر نہیں کرتے۔

اگر نیکی پڑھائی جاسکتی ہوتی تو ہم توقع رکھتے کہ ایسے ماہرین ضرور ہوتے جو نیکی کا امتحان اور ٹیسٹ لے سکتے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کیا دیانت دار یا جذبہ ہمدردی کا حامل ہونا پیدائش عمل ہے؟ جیسے کسی کی کالی، نیلی آنکھیں یا چپٹی ناک۔ کیا مضحکہ خیز آئیڈیا نہیں لگتا کہ ایسے خصوصی تربیت یافتہ انسٹرکٹر مقرر کیے جائیں، جو محنت کرنے، اپنی خودی کو مارنے اور شجاعت کے اسباق پڑھایا کریں۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور مبہم طور پر محسوس بھی کرتے ہیں کہ نیکی کے کوئی اسپیشلسٹ نہیں ہوتے۔ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم صحیح اور غلط کا فرق جانتے ہیں لیکن اسے ایسا علم نہیں سمجھتے جیسے علم ریاضی یا علم فلکیات، جن کو اسکالرز اور سائنس دان ہمیشہ سے ترقی دے رہے ہوں۔

افلاطون کے ڈائیلاگ میں پروٹاگورس سقراط سے کہتا ہے کہ تمہیں اس سوال پر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے لیے وہ ایک بڑی دلچسپ متوازی مثال پیش کرتا ہے'' بچے کے لیے اہم ترین چیزوں میں مادری زبان کو بولنا اور سمجھنا ہے۔ اگرچہ یونانی زبان کا علم یونانی بچے میں پیدائشی نہیں ہوتا جیسے اس کی نیلی آنکھیں اس کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں لیکن پھر یونان میں ابھی تک یونانی زبان کے پیشہ ور ٹیچر موجود نہیں ہیں تو اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ شروع میں بچے کے ماں، باپ اور پھر اس کے ساتھی اور پھر وہ سب لوگ جن کو شروع سے وہ ملتا ہے اس کے یونانی بول چال کے غیر پیشہ ورانہ استاد بن جاتے ہیں۔ بچہ اپنی مادری زبان کسی خاص ماہر زبان سے نہیں سیکھتا بلکہ وہ اسے ہر ایک سے حاصل کرتا ہے''، پروٹاگورس، اسے کہتا ہے کہ اس طرح ہم کریکٹر کے معیار بھی سیکھ لیتے ہیں اس کے لیے ہمیں کسی پنڈت سے باقاعدہ سبق لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم انھیں گھر، گلیوں، سڑکوں، کھیل کے میدانوں اور بازاروں میں غرضیکہ ہر جگہ اور ہر ایک سے سیکھ رہے ہوتے ہیں۔ پروٹاگورس اس سوال کے حل میں واضح کرتا ہے کہ کردار کے معیارات کو ہم چھوٹی عمر میں ہی سیکھ لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کردار کوئی ایسا پراسرار علم نہیں جس کے لیے اسپیشلسٹ درکار ہوں بلکہ عام فہم چیز ہے جسے تقریباً ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے۔ نیکی کے علم میں کوئی نو آموز نہیں اور کوئی ماہر فن نہیں۔ اخلاقی معیارات پیدائشی طور پر انسان

کے اندر نہیں ہوتے بلکہ وہ سیکھے جاتے ہیں۔ اپنے گرد و پیش سے۔ یہی وجہ ہے کہ صبر' اخلاص' خیرات اور پرہیز گاری کے پروفیسروں کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ یہ خیال ہی مضحکہ خیز لگتا ہے کہ وفاداری' انکساری اور سخاوت کے ماہر معلم (Tutors) اور نیکی کے رٹو ہونے چاہیے۔ نیکی رٹا لگانے سے نہیں آتی۔ کوئی بچہ یکبارگی سائیکل چلانا نہیں سیکھ سکتا' اسے سیکھنا پڑتا ہے کہ توازن کیسے قائم کھنا ہے' اسے آگے کیسے لے جانا ہے' موڑنا اور بریک کیسے لگانا ہے۔ لیکن وہ ان سب کاموں کو محض زبانی یاد کر کے نہیں سیکھ سکتا۔ خواہ اس کے باپ نے ان سب حرکات کو مربوط کرنے کے لیے کتنا ہی اچھا زبانی سمجھایا ہو' باپ کے محض لیکچر سے بچے میں سائیکل چلانے کی مہارت نہیں پیدا ہو جائے گی' بچے کو بتانے کی نہیں دکھانے اور پریکٹس کروانے کی ضرورت ہوگی' اسے ان تمام تکنیک کو بار بار خود آزمانا ہوگا اور ان سے انحراف کے نتائج کو سمجھنا ہوگا۔ اس طرح وہ بتائے جانے سے زیادہ تعلیم یافتہ اور سکھائے جانے سے زیادہ تربیت یافتہ بن جائے گا۔ ہنر اور مہارتیں مثالوں اور مشق کرنے سے آتی ہیں۔ محض نصیحت آمیز گفتگو سے ان کا رٹا نہیں لگوایا جا سکتا اور اس اصول کا اطلاق تعلیمی اور ذہنی کاموں پر بھی اسی طرح ہوتا ہے' ان کی مہارت بھی پریکٹس سے ہی آتی ہے۔

محض اخلاقی خطبے اور ایسے وعظ زبانی یاد کر لینا کافی نہیں جو طمع' تعصب یا کاہلی کو دور کرنے کے پند و نصائح سے بھرے ہوئے ہوں۔ نفس پر قابو پانے' انصاف پسند اور محنتی ہونے کے لیے ہمارے لیے دوسروں کی قائم کردہ مثالیں ہی کارگر ہوں گی جن کو دیکھ کر ہم بھی عمل کریں گے۔ ناکام ہوں گے' پھر عمل کریں گے' ہنر اور فنون کی طرح اخلاقی معاملات میں بھی ہم سب سے پہلے دوسروں کو دیکھ سکتے ہیں۔ پھر دوسروں سے تربیت حاصل کرتے ہیں جس کے دوران کبھی تعریف اور پھٹکار بھی سننی پڑتی ہے' کردار و اخلاق کے سبق لیکچروں سے نہیں بلکہ مثالیں دیکھنے سے اور خود تربیتی سے حاصل ہوتے ہیں۔ نیکی' رٹے لگانے یا اخلاقی سبق یاد کر لینے سے نہیں پیدا ہوتی' جس طرح کوئی کرافٹ فن یا ہنر محض لیکچر سننے سے نہیں آ جاتا۔ لہٰذا سقراط کو ارسطو نے جواب دیا کہ اگر نیکی کے پروفیسر نہیں پائے جاتے تو اس میں حیرانگی کی کوئی بات نہیں' نیکی

مشق کرنے سے سیکھی جاتی ہے' زبانی یاد کر کے عقائد کو سیکھنا ایک اور طرح کی تعلیم ہے اور عملی مشق سے کسی چیز کو سیکھنا دوسری طرح کی تعلیم ہے۔ سقراط کو پریشانی اس لیے تھی کہ وہ پیانو بجانا اور غصے پر قابو کرنے کو سیکھنا' عقائد کی سکھائی کے عمل سے مشابہ سمجھتا تھا۔ ہمیں خود کو اس مفروضے سے آزاد کرنا چاہیے کہ سب اسباق محض تحکمانہ فرمان (Dictations) اور ہر تعلیم کا مطلب زبانی یاد کرنا ہے۔ صلاحیتیں بھی حاصل کی جاتی ہیں اور تماشوں کا ذخیرہ بھی لیکن صلاحیتیں تماشوں کا ذخیرہ نہیں ہوتیں جنھیں کسی وقت بھی دکھایا جاسکے چنانچہ ہمارے اساتذہ اور پروفیسروں کو اپنا زیادہ وقت عملی مشق اور تربیت کے ذریعے پڑھانے میں صرف کرنا چاہیے نہ کہ املاء اور آمرانہ لیکچروں سے۔

یہ سوال بھی کیا جاسکتا ہے کہ دیگر فنون سکھانے کے لیے بہرحال پروفیشنل استاد موجود ہوتے ہیں۔ نیکی پڑھانے کے لیے کیوں نہیں؟ آخر انگریزی بول چال اور تقویٰ و رواداری کے سیکھنے میں کیا فرق ہے؟ کیا احساسات کے اسباق ترتیب دیے جاسکتے ہیں اور جذبات کے امتحان لیے جاسکتے ہیں؟ رویوں کے کورس کروائے جاسکتے ہیں۔ نیتوں (Motives) کی آزمائشیں اور مشقیں (Drills) کروائی جاسکتی ہیں؟ یہ بھی ہمارے مشاہدے کی بات ہے کہ لوگ مفادات کے پس منظر میں کبھی چھوٹی غلطی کو بڑی اور کبھی بڑی غلطی کو معمولی قرار دے کر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ دراصل گردوپیش کے ماحول میں لوگوں کے بے شمار رویوں' مشاہدات' عمل اور ردعمل سے ہم ''نیکی'' کا سبق ''پڑھ'' رہے ہوتے ہیں دوسروں کی مثالوں' اظہاروں' تقریروں' ہدایتوں اور تربیتوں کے زیر اثر ہم کردار کے مختلف معیاروں کو سیکھ رہے ہوتے ہیں۔ نیکی کی ''پڑھائی'' میں قول و فعل کا تضاد یا مطابقت بہت بڑا کردار ادا کرتی ہے۔ اگر معاشرہ دوہرے معیاروں پر چل رہا ہے۔ لوگوں نے کرنے کے لیے اور کہنے کے لیے اور معیار بنا رکھے ہیں تو نیکی کے بڑے سے بڑے سلیبس بھی اس معاشرے کا کچھ نہ کر سکیں گے۔ کیا ہم ایک ایسے معاشرے میں نہیں رہ رہے جہاں انسان ایک حیوانی ڈیپارٹمنٹل اسٹور بن چکا ہے۔ جس میں عقل ایک ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔ قوت ارادی دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں احساسات کسی تیسرے ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔ عقل

وذہانت کے ڈیپارٹمنٹ میں اسباق (Lessons) دیے جاتے ہیں لیکن ارادے اور حساسات ناقابل تدریس ہیں۔ وہ مہذب انسان میں بھی اس طرح ہیں جیسے وحشیانہ دور میں تھے۔ جذبوں اور احساسات کی تدریس (Schooling) نہیں ہوسکتی۔ وہ آج بھی حیوانی سطح پر ہی کارفرما ہیں' یہی وجہ ہے کہ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں انسان ایک انتہا پسندی سے دوسری انتہا پسندی میں چلا جاتا ہے۔ دین' ایمان' عقیدہ اور سب اخلاقیات دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

نیکی کو چنگ اور (Dictate) کرنے کی چیز نہیں۔ کیا ایک آدمی کو فریب دہی نہ کرنا سکھائی جاسکتی ہے۔ جب آپ کسی کو دیانت داری ''پڑھا'' رہے ہوں گے تو وہ اسی وقت بددیانتی کا سبق بھی حاصل کر رہا ہوگا۔ نیکی کے سبق بھی ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے آپ نے کوئی کام سیکھا لیکن بعد میں پریکٹس نہ کرنے کی وجہ سے اسے بھولتے چلے جاتے ہیں' یہ بالکل اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کتابوں میں بادشاہوں یا دیگر تاریخی شخصیات کے مرنے جینے کی تاریخیں یاد کروائی جاتی ہیں جو بعد میں بھول جاتی ہیں۔ پھر علم ہونا اور چیز ہے اور پرجوش (Keen) ہونا اور چیز ہے۔ آپ پڑھانے سے نیکی کا علم تو دے دیں گے لیکن لوگوں کو اس کے بارے میں پرجوش کیسے کریں گے۔ کسی کھیل کا علم ہونا اور اس میں اچھا کھیلنا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ سقراط ہم سے پوچھتا ہے کہ نوجوانوں کو راست باز' محنتی اور اچھے کردار کا حامل بنانے کے لیے کون سے اساتذہ ہوسکتے ہیں؟ تو اس کے جواب کے لیے نوجوانوں سے ہی پوچھنا چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کس کے مطابق گزارنا چاہتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ (Conditioning) کے بغیر نہ آداب سیکھے جاسکتے ہیں' اخلاق اور نہ ہی تلفظ زبان' لیکن بڑے ہوکر انسان خود ہی سوچنا شروع کر دیتا ہے کہ اسے اب جبلتوں کے مطابق ردعمل نہیں دینا۔ اب وہ احمق بھی بن سکتا ہے اور سمجھدار بھی۔ لیکن آگے یہ سوال بھی آجائے گا کہ اس بات کا فیصلہ کیسے کیا جائے گا کہ فلاں کام ''نیک'' ہے۔ یعنی نیکی کسے کہتے ہیں؟

یہ بحث ہمیں کہیں بھی لے جائے لیکن ایک بات طے ہے کہ پڑھانے سے نیکی بڑھا

نہیں کرتی۔ نیکی پڑھانے کی نہیں کرنے کی چیز ہے۔ کسی معاشرے میں جتنی نیکی کی جارہی ہوتی ہے اتنی ہی وہ موجود ہوتی ہے۔ دینیات کے لازمی مضامین رکھنے اور اخلاقیات کے لمبے لمبے لیکچر دینے سے معاشرہ کبھی صالح نہیں بنتا۔ اس سے رجعت پسند ملاؤں اور منافق حکمران طبقوں کو تقویت ضرور مل جاتی ہے۔ نیکی اور برائی کے عوامل کتابوں میں بند نہیں ہوتے۔ ہمیں ہر وقت قوم کے اخلاق بگڑ جانے کا ڈر کیوں لگا رہتا ہے۔ کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ ہم سب ایک دوسرے کو بے وقوف بنا رہے ہیں ورنہ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ ہمارے معاشرے کے سب افراد اور طبقات کا دیوالہ کب کا نکل چکا ہے۔ ایسے میں معاشرے کے سب افراد اور طبقات ایک دوسرے کے سامنے زیادہ سے زیادہ نیکی کا مبلغ ثابت ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح کی ''نیکی'' پڑھانے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ مسائل کا سائنسی تجزیہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے وہ چاہیں بھی تو مسائل اور برائیوں کی اصل وجوہات تک نہیں پہنچ پاتے اور بظاہر ''نیکی کا دلدادہ'' معاشرہ برائی کے جہنم کے اور نچلے حصوں میں گرتا چلا جاتا ہے۔ دینیات پڑھانے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگوں کی سوچ سطحی ہو جاتی ہے۔ مثلاً پوچھا گیا کہ لوگ رشوت کیوں لیتے ہیں؟ جواب تھا کہ خوف خدا نہیں رہا۔ حالانکہ رشوت لینا اور خوف خدا کا نہ ہونا۔ دونوں (Effects) ہیں علت (Cause) نہیں۔ وجہ کا تو پھر بھی پتہ نہ چلا۔ صرف سائنسی انداز فکر اور معاشرے کے تانے بانے کا سائنسی اور عقلی تجزیہ ہی ہمیں مسائل کی گہرائی تک جانے کا رستہ دکھلا سکتا ہے۔

❖.....❖.....❖

ہمارا نصاب تعلیم اور ''مطالعہ پاکستان''

کیا حب الوطنی کے لیے متعصّب تاریخ ضروری ہے؟

ہر قوم اپنے نصاب تعلیم کا کچھ حصہ اپنی قومی ھیئت ترکیبی، تاریخ اور اپنے ملک کے خدوخال کے لیے وقف کرتی ہے تا کہ آنے والی نسلوں کو اپنے قومی تشخص سے واقف ملتی رہے اور وہ بحیثیت قوم اپنے ملک کی تعمیر و ترقی میں مثبت کردار ادا کرتے رہیں۔ پاکستانی قوم کا مسئلہ یہ رہا ہے کہ آزادی کے فوری بعد قومی تشخص سے متعلق مسائل پر ایک مخصوص نقطہ نظر عائد کر دیا گیا جس پر معروضی تجزیہ و تحقیق کے دروازے بند کر دیے گئے کہ آیا یہ نقطہ نظر ہمارے دوررس قومی مفادات اور یک جہتی کے لیے موزوں بھی ہے یا نہیں۔ مذکورہ ''قومی فکر'' کی تشکیل میں مندرجہ ذیل عوامل نے اہم کردار ادا کیا۔

(i) پاکستان کا ظہور تاریخ کے غیر معمولی واقعات کا نتیجہ تھا۔ معرض وجود میں آنے سے قبل بحیثیت قوم اور ملک اس کی اپنی آزادانہ کوئی تاریخ نہ تھی۔ چنانچہ اس کے بننے اور بنانے کے اسباب کی تلاش میں بہت سے مصنوعی اور غیر حقیقی عناصر بھی شامل ہو گئے۔ اس خوف سے کہ پاکستان کے نام سے ایک نئی قوم کی تشکیل ہوئی ہے ہماری ''اسٹیبلشمنٹ (Establishment)'' اس کی بنیادوں کی مضبوطی کے بارے میں شکوک کا شکار ہو گئی۔

گو آزادی کے بعد پاکستان تاریخ کی ایک زندہ حقیقت تھا جسے اس کے عوام نے اپنے جذبوں سے تشکیل دیا تھا۔ لیکن اس ملک کے پالیسی ساز اپنے عوام کے جذبۂ حب الوطنی کی

طاقت پر بھروسہ کرنے کی بجائے مصنوعی قومی و تاریخی نظریے اور مقدس بیساکھیاں پکڑانے پر ضد کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ اس ملک کو ایک طاقت ور آرمی اور مضبوط بیوروکریسی ہی مستحکم اور متحد رکھ سکتی ہے۔ ان مذکورہ اداروں کی اپنی مضبوطی اور استحکام کا فطری نتیجہ یہ نکلا کہ مستقل غیر معمولی اور ایمرجنسی حالات میں رہنا اس ملک کا مقدر بن گیا۔ ظاہر ہے نتائج الٹ برآمد ہوئے۔ یہ ملک آدھا بھی ہوا اور پچھلے پچاس سال سے مسلسل سیاسی، اقتصادی بحران کا شکار بھی ہے۔

(ii) اس ''قومی فکر'' کے خدوخال میں پاکستانی معاشرے کو ایک قدامت پسند معاشرے کے طور پر پیش کیا گیا۔ مذہبی اور قومی اقدار کے نام پر قدامت پرستی پاکستان کی شناخت بن گئی۔ روشن خیالی اور ترقی یافتہ ہونے کی خواہش یوں پس پشت چلی گئی کہ تعلیم کو قومی ترجیحات کے نچلے ترین درجے میں رکھ دیا گیا۔

(iii) اس طرح کے نظریۂ پاکستان سے فیوڈل کلاس اور عسکری و سول بیوروکریسی کے مفادات کو دوام بخش دینے کی ضمانت حاصل ہوگئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے بنانے میں یہاں کی آبادی کے مسلم تشخص کو بطور سیاسی جواز پیش کیا گیا لیکن اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ پاکستان دنیا میں اسلام کے نام پر کوئی فرقہ ورانہ کردار ادا کرے یا برصغیر اور جنوبی ایشیاء میں ایک مستقل منفی سیاست کا لازمی حصہ بن جائے۔ اقبال اور قائد سے لے کر اس کے بنانے والوں میں کوئی بھی بنیاد پرست نہیں تھا۔ پاکستان اسلام کا قلعہ بنانے کے لیے نہیں بلکہ پاکستان عوام کی خوشحالی اور فلاح و بہبود کی ضمانت حاصل کرنے کے لیے بنایا گیا تھا جو متحدہ ہندوستان میں ممکن نہ تھی۔ آیئے دیکھیں ہمارے ہاں نظریہ تاریخ کیسے مسخ ہو!

پہلا مسئلہ قومیت کی بنیاد کی تلاش تھا۔ ''پاکستانی قومیت'' پر پہلا شب خون یہ کہہ کر مارا گیا کہ چونکہ ہم مسلمان ہیں اس لیے ہم ایک قوم ہیں۔ مسلم تشخص و ثقافت کے حوالے سے ایک الگ ملک کے مطالبے کا تعلق 1947ء سے پہلے کا تھا۔ جو برصغیر کے مخصوص تاریخی حالات کا نتیجہ

تھا۔لیکن ایک آزاد اور خود مختار ملک بن جانے کے بعد قومی تشخص کی بنیاد خود پاکستان کی اپنی سرزمین بننی چاہیے تھی۔ اسلام کی بنیاد پر قومیت کا دعویٰ کئی طرح کے تاریخی' فطری اور سائنسی حقائق سے روگردانی پر مبنی تھا جس سے ہم بحیثیت قوم کئی طرح کی پیچیدگیوں کا شکار ہو گئے۔

(i) دنیا میں اس طرح کا دعویٰ کرنے والے ہم پاکستانی مسلمان اکیلے ہی تھے' دیگر مسلمان اور خصوصاً عرب مسلمان قومیت کی بنیاد مذہب کو قرار نہیں دیتے۔ اسلام کا ملی تصور قومیت سے الگ چیز ہے' عرب عجمی مسلمانوں کو ہم قوم نہیں سمجھتے۔ قومیت کا تعلق نسلی' تاریخی اور مخصوص جغرافیائی حوالے سے ہوتا ہے۔ اس لیے خود عرب مسلمان بھی مختلف قوموں اور قبائل پر مشتمل ہیں۔ مصری' شامی' عراقی' فلسطینی سب الگ الگ قومیں ہیں۔ اسی طرح عیسائی دنیا بھی ایک مذہب ہونے کے باوجود اپنے اپنے وطن کے حوالے سے الگ الگ قومی تشخص رکھتی ہے۔ جرمن جرمن قوم ہے' فرانسیسی فرانسیسی قوم انگریز انگریز قوم ہے۔ اسی طرح مذہب سے قطع نظر ہم پاکستانی قوم کیوں نہیں ہو سکتے اور اگر ہم ایسا کریں گے تو ہمیں یہ خوف نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی پاکستان ہم سے خدانخواستہ چھین لے گا یہ کہہ کر کہ آپ نے مسلم تشخص کی بنیاد پر اسے لیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد وہ ایشو وہیں پر ختم ہو گیا تھا اور اس حقیقت کو قائداعظم نے بھی بڑا بروقت محسوس کیا۔ انھوں نے آئین ساز اسمبلی کی اپنی پہلی تقریر میں ہی کہہ دیا' ''کہ آج کے بعد پاکستان میں کوئی مسلمان' مسلمان اور کوئی ہندو ہندو نہیں' ہم سب ایک پاکستانی قوم ہیں.....''

(ii) قومیت کی بنیاد مذہب پر رکھی تو تاریخ کے کئی ''گناہ'' ہمیں اپنے کندھوں پر اٹھانے پڑے۔ ہم نے بڑی بڑی باتیں شروع کر دیں ''جی برصغیر میں پاکستان اسی وقت بن گیا تھا جب یہاں کا باشندہ پہلا مسلمان بنا تھا۔'' ایسے دعوے سے کتنے ضرر رساں مضمرات پیدا ہو جاتے ہیں' ہمارے ان ''دانش وروں'' نے کبھی نہیں سوچا۔ تاریخ کا پورا نوآبادیاتی فلسفہ ہی مسخ ہو گیا۔ اسی طرح نوآبادیاتی نظام کو ہمیں دو قسموں میں تقسیم کرنا پڑا جائے گا۔ ایک ''نیک نوآبادیاتی نظام'' ہوتا ہے اور دوسرا استحصالی نوآبادیاتی نظام عرب' افغان' ایران' ترکی اور سنٹرل ایشیا کے مسلمان

برصغیر میں حملہ آور ہوئے اور حکمران بن گئے تو یہ ''نیک نوآبادیاتی نظام'' ہوا!! فی الحال اس بحث سے قطع نظر کہ مذکورہ حملہ آوروں کی نیتوں میں کتنی ''نیک خواہشات'' شامل تھیں۔ کیا یہ اصول بنایا جاسکتا ہے کہ ایک قوم کو دوسری قوم پر قابض ہونے کی اجازت اس شرط پر دے دی جائے کہ وہ مقبوضہ قوم کے ساتھ نیک سلوک کرے گی۔ اسے راہ راست پر لائے گی؟ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے دنیا کا کوئی مہذب انسان اور قوم اس اصول کو تسلیم نہیں کرسکتی لیکن ہم پاکستانی پورے شدومد کے ساتھ ایسے ہی اصول پر مبنی تاریخ کو اسکولوں میں پڑھا رہے ہیں۔ ہماری تاریخ کے مضمون کا ایک ہی مقصد ہے کہ مسلمان حملہ آوروں اور بعد از فتح ان کی حکمرانی اور دیگر اچھے برے اعمال کو آنکھیں بند کر کے جائز مانا جائے۔ ہمیں برصغیر کی پوری تاریخ کو ہی تعصب کی بنیاد پر استوار کرنا پڑ گیا۔ اب کیا تھا۔ مسلمان اچھے' ان کا ہر کام اچھا اور ہندوؤں کی ہر چیز غلط' جھوٹی' متعصب قرار پائی۔ تاریخ کی ساری معروضیت ہی فنا ہوگئی جس سے قومیں سبق حاصل کرتی ہیں اور اپنے مستقبل کو سنوارتی ہیں۔ ''ایک عورت کی عزت کو بچانے'' کے لیے کسی ملک پر قبضہ کر لینا زیب داستان کے سوا کچھ نہیں اور تاریخ کا مذاق بھی'' ہمیں عربوں کے برصغیر پر حملہ آور ہونے کی طویل منصوبہ بندی اور دیگر سیاسی و اقتصادی اسباب بھی بتانے چاہیں۔ اور خود محمد بن قاسم کا انجام کیا ہوا۔ وہ بھی ہمیں اپنے بچوں کو بتانا چاہیے۔

(iii) قومیت کی بنیاد اسلام پر رکھی تو ایک اور ٹھوکر کھائی وہ یہ کہ عربوں کی تاریخ کو ہم نے ''اسلامی تاریخ'' کہنا شروع کر دیا۔ اسلام ایک مذہب تھا۔ اسلامی تاریخ سے مراد صرف دین اسلام کی ہی تاریخ ہوسکتی تھی اور وہ تاریخ رسول پاکؐ کی ذات مبارکہ تک چلتی ہے۔ جب دین مکمل ہوا۔ تو اسلامی تعلیم بھی مکمل ہوگئی۔ اس کے بعد مسلمان عربوں کی تاریخ ہے وہ اسلام کی تاریخ نہیں ہے۔ ہم نے مسلم حکمرانوں کی تاریخ کو تقدس بھری نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ خواہ ان کا تعلق کسی بھی خطے اور زمانے کے ساتھ ہو۔ اسے ہم نے ''اپنی تاریخ'' بنالیا۔ عربوں کی تاریخ ادھر برصغیر میں بیٹھے بیٹھے ''ہماری'' ہوگئی۔ نظام ملوکیت کے حامل خلفاء ہوں یا موروثی

بادشاہتیں، ہمارے لیے سبھی کی تاریخ اسلامی اور مقدس ٹھہری۔ ہم نے ان کو خوامخواہ اپنا کہنا اور ان کی تمام برائیوں پر پردہ ڈالنا شروع کر دیا حالانکہ مسلمان بادشاہوں کا کردار کسی بھی دوسری قوم کے بادشاہوں سے مختلف نہیں تھا۔ عوام سے دوری، محلاتی سازشیں، پرتعیش زندگی، معاشرے کے طاقت ور طبقوں کے مفادات کی حفاظت، داخلی بغاوتیں اور ان کی سرکوبی، الغرض روایتی بادشاہوں کے سبھی ''اجزائے ترکیبی'' موجود تھے۔ کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ دوسری قوموں اور ملکوں پر چڑھائی کا مقصد صرف فروغ دین تھا؟ اس میں مادی مفادات کا کوئی دخل نہیں تھا؟ عقیدت کے زور میں خیالی تاریخ کچھ بھی بنائی جا سکتی ہے لیکن تاریخ میں جا بجا پڑے ننگے حقائق بڑی تلخ کہانیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ چنانچہ عربوں اور دیگر مسلم قوموں کی تاریخ نہ تو اسلامی ہے اور نہ ہی ہماری۔

(iv) برصغیر کے مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کے حوالے سے بھی ہم جو کچھ کہتے ہیں۔ صداقت پر مبنی نہیں ہے۔ سومنات کے مندر پر درجنوں حملوں کا ذکر بڑے فخر سے کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلامی رواداری کا ذکر بھی خوب چلتا ہے۔ تاریخ میں اس بات کے بڑے شواہد موجود ہیں جب مسلمان بادشاہوں نے مندروں کو گرا کر مسجدیں تعمیر کروا دیں۔ ہمارے ہاں کی تاریخ میں تضاد بیانی سے کام لیا جاتا ہے اور حقیقتوں سے نظریں چرائی جاتی ہیں۔ اگر ہم نے برصغیر کے مسلمان حکمرانوں کی ناجائز حرکتوں پر مذمت کی ہوتی اور خود کو ان سے الگ رکھا ہوتا تو آج کسی ہندو کو بابری مسجد شہید کرنے کی جرات نہ ہوتی۔ عجب تضاد ہے۔ ہمارے پاس طاقت ہو اور ہم دوسروں کی عبادت گاہوں پر حملے کریں تو قابل فخر ہے لیکن یہی سلوک ہماری عبادت گاہوں پر ہو تو تکلیف کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں برصغیر کی پوری تاریخ ہی مسخ کر کے پڑھائی جاتی ہے۔ ٹوپیاں سی کر گزارہ کرنے والے بادشاہ کے بارے میں یہ نہیں بتایا جاتا کہ اس نے اقتدار کے لیے اپنے بھائیوں کو قتل کیسے کیا تھا۔ باپ کے ساتھ قید میں کیا سلوک روا رکھا۔ اس کی آنکھیں کیسے نکلوائی تھیں۔ مسلمان بادشاہوں کی سچی جھوٹی خوبیوں کو

اچھالا جاتا ہے اوران کی خامیوں کا ذکر نہایت سرسری انداز سے کیا جاتا ہے۔ بابا گورونانک جیسے صوفی منش شخص نے ''گرنتھ صاحب'' میں ذکر کیا ہے کہ ''مغلوں کی شکل میں موت کا دیوتا اتر آیا ہے'' اور یہ بات اس وقت کہی جب بابر کی فوج نے انڈیا پر قبضہ کرنے کے لیے مصائب کے پہاڑ توڑ دیے جب کہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ بیرونی مسلمان حملہ آوروں کے آنے پر ہندوستان کے عوام نے ان کے قدموں کے نیچے سرخ قالین بچھا دیے.....سوچنے کی بات ہے جن افغانوں نے آج بیسویں صدی کے آخر میں اپنے ہی ملک اور اپنے ہی عوام کے ساتھ وحشت و بربریت کی ایسی کہانی رقم کر دی ہے جس سے ان کا اپنا ملک ہی پتھر کے زمانے میں چلا گیا ہے انھوں نے آج سے پانچ چھ سو سال پہلے برصغیر میں کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ ماضی کی تاریخ کے بارے میں جھوٹ بولا جاسکتا ہے کہ اس کا چشم دید گواہ کوئی نہیں ہوتا لیکن ہماری کذب آرائی اس حد کو پہنچی ہوئی ہے کہ ہم آج کے سامنے والے حالات کے بارے میں سفید جھوٹ بولنے سے گریز نہیں کرتے۔ ہماری آج کی میٹرک کی کتاب ''مطالعہ پاکستان'' کا راوی افغانستان میں چین لکھتے ہوئے کہتا ہے ''نئی افغان حکومت ملک کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہے۔'' ہمارے طلباء اس بات کا رٹا اس وقت لگا رہے ہیں جب مختلف ''مجاہد'' گروپ کابل کی اینٹ سے اینٹ بجا رہے ہیں.....!! (بوقت تحریر نومبر 1996)

(v) قومیت کی بنیاد اگر مذہب کو قرار دیا جائے تو ہر مسلم ریاست کے لیے آئینی اور سلامتی کے مسائل پیدا ہو جائیں۔ اگر مسلمان ہونے کے ناطے ہم سب ایک قوم ہیں۔ تو مسلم ملکوں کے بیچ مسلمانوں کے آنے جانے پر ویزے اور امیگریشن کی رکاوٹیں نہیں ہونی چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ قومیت کی پاکستانی میڈ تعریف کوئی دوسرا ملک تو کیا خود پاکستانی ریاست تسلیم کرنے کو افورڈ نہیں کر سکتی۔

(vi) قومیت کی بنیاد اسلام کو قرار دینے سے ہم نے غیر مسلم پاکستانیوں کو دوسرے درجے کے شہری بنا دیا۔ ازمنہ وسطی میں ''ذمیوں'' کا تصور چل سکتا تھا لیکن آج کے انسان کا مہذب ذہن

ریاست کے باشندوں کے درمیان اس طرح کی تمیز وتفریق کو تسلیم نہیں کرسکتا اور یہ قائداعظم کے ارشادات کے قطعی منافی ہے۔ ذرا اس منظر کو چشم تصور میں لائیے کہ پاکستانیوں کا ایک گروپ بیٹھا ہے جس میں غیر مسلم پاکستانی بھی موجود ہیں۔ مسلم پاکستانی کہہ رہے ہیں۔ ''پاکستان مسلمانوں کا ملک ہے۔ اس میں صرف اسلام چل سکتا ہے۔ یہ اسلام کے لیے بنایا گیا ہے۔ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے وغیرہ وغیرہ۔'' کیا ایسی گفتگو پر غیر مسلم پاکستانی خود کو اجنبی محسوس نہیں کرنے لگے گا؟ اس کا پاکستان سے تعلق کمزور نہیں ہوجائے گا؟ وہ سوچ میں نہیں پڑ جائے گا کہ یہ زمین تو اس کی بھی ہے صدیوں سے یہ وطن تو اس کا بھی ہے۔ فرقہ ورانہ بنیادوں پر شہریوں کے درمیان تقسیم سامراجیت کی بدترین شکل ہے۔ پاکستان کو صرف اسلام کے نام سے منسوب کرکے ہم اپنے غیر مسلم ہم وطن شہریوں کا حق وطنیت چھین لیتے ہیں۔ جب اکثریتی عقیدے کے باشندے اس وطن کو اپنے مذہب کے نام قرار دے رہے ہوں تو انھیں اس وقت غیر مسلم پاکستانیوں کے جذبات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ تمام فطری اور اخلاقی جواز کے مطابق ان کا اس ملک پر اتنا ہی حق ہے جتنا اکثریتی عقیدہ رکھنے والوں کا۔

مندرجہ بالا غلط قومی نظریات اور غلط قومی رویوں کی وجہ سے ہم ابہام کا شکار ایک بے سمت قوم بن چکے ہیں۔ ہم پاکستانیوں نے ساری دنیا کے مسلمانوں اور ساری تاریخ اسلام کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے۔ پاکستان پاکستانی عوام کی فلاح و بہبود کے لیے بنا تھا۔ ایک ترقی یافتہ پاکستان سارے عالم اسلام کے لیے بھی فخر کا سبب ہوگا۔ پاکستان کی پہچان بہرحال مسلم ثقافت ہی رہے گی۔ اس کے لیے کوئی ضروری نہیں کہ ہم بھول جائیں کہ انسان پہلے ہوتا ہے، عقیدہ بعد میں ہم کون ہیں؟ سیدھی سی بات ہے ہم پاکستانی ہیں۔ اس میں مذہب کا عنصر ثانوی ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے اکثریتی عوام کا مذہب اسلام ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم پورے عالم اسلام کی تاریخ کا ٹھیکہ لے لیں اور تاریخ کے بارے میں متعصّب رویہ اپنالیں۔ قوموں کی داخلی اور خارجی لڑائیوں کے پس منظر میں ہمیشہ مفادات کام کر

رہے ہوتے ہیں اور عقائد محض بطور ٹائیٹل استعمال ہوتے ہیں ورنہ ان کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ نے حکم جاری کر دیا کہ کوئی عرب فوجی' مقبوضہ علاقوں کی سرزمین اپنی ملکیت میں نہیں رکھ سکے گا۔ تو اس کا مطلب اسلام کے کسی اعلیٰ اصول کا نفاذ نہیں بلکہ یہ تھا کہ ان کی فوج کہیں مقبوضہ علاقوں میں ہی جا کر نہ بیٹھ جائے۔ اس حکم کا مقصد فوج کے منتشر ہونے کو روکنا تھا۔ دوسرا انھیں پتہ تھا کہ مقبوضہ علاقے کے مقامی کسان ان کی نسبت زیادہ ٹیکس ادا کریں گے مزید برآں ان عرب بدووں کو زمینداری کا کچھ تجربہ نہیں یہ ان کی زمینیں برباد کر دیں گے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ کی اس وقت تک سمجھ نہیں آ سکتی جب تک آپ عقیدے کی عینک نہیں اتارتے۔ جب کہ پاکستان میں ساری کی ساری تاریخ عقیدے کے نہایت موٹے شیشے لگا کر پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ کہ ہم تاریخ کو اپنی خواہشات کے مطابق موڑ دیتے ہیں۔ تاریخ معروضیت' تحقیق' غیر جانبداریت اور سائنسی فکر کا مطالبہ کرتی ہے جب کہ ہمارے ہاتھ میں عقیدے کا ڈنڈا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم (History Blind) ہو چکے ہیں۔ گزرا ہوا واقعہ کتنا ہی المناک کیوں نہ ہو۔ ہماری قومی صحت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ حقائق سے نظریں چرانا ہمارا شیوہ بن چکا ہے۔ ورنہ پاکستان ٹوٹنے کا واقعہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کا یوں نہ پڑھاتے کہ ہماری ٹیکسٹ بک چند سطروں میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہے کہ انڈیا نے مکتی باہنی فوج کو تربیت دی تھی چنانچہ اس کی مداخلت سے پاکستان ٹوٹ گیا۔ اپنی ہی تاریخ سے نہایت سبق آموز اور المناک واقعے پر ایسی بے حسی کا مظاہرہ بڑے دل گردے کی بات ہے۔ گویا ہماری غلط سیاسی' اقتصادی' اور قومی پالیسیوں کا اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ ہم تو ازل سے پاک ہیں' پاک ہی رہیں گے۔ اس ملک کے کارپردازوں کو کوئی پرواہ نہیں کہ یہ غفلت و بے خبری ہمیں مستقبل کے اندھے کنوئیں میں پھینک رہی ہے۔ تاریخ تو خود احتسابی کا نام ہوتا ہے۔

خود احتسابی کے لیے خود تنقیدی کا جوہر ہونا ضروری ہے اس کے لیے ہمیں تقدس اور تعصب سے باہر آنا ہوگا۔ اپنی قومی نفسیات کو از سر نو تشکیل دینا ہوگا۔ قومی یکجہتی کی نئی جڑیں تلاش

کرنی ہوں گی۔ جس کا تعلق پاکستان کی زمین اور پاکستان کے عوام ہوں۔ دنیا کا کوئی عقیدہ اور ازم پاکستان کو خوشحال اور ترقی یافتہ ملک نہیں بنا سکتا۔ صرف سائنس' ٹیکنالوجی اور تعلیم سے ہی ہم ایک خوبصورت' باعزت خوشحال قوم بن سکتے ہیں۔ پاکستان کے اکثریتی عوام مسلمان ہیں۔ یہ شناخت قائم رہے گی۔ اسے کوئی خطرہ نہیں۔ عقیدے کا تعلق دلوں سے ہے' جب کہ یہ دنیا مادی ہے' تاریخ مادی ہے' جو عقیدے کی زبان نہیں سمجھتی۔ اس دنیا و کائنات سے صرف سائنس کی زبان سے ہی ہم کلام ہوا جا سکتا ہے' اسے سائنس کی زبان سے ہی سمجھا جا سکتا ہے' چنانچہ اپنی روزمرہ زندگی میں ہمیں سائنس کی زبان اپنانی چاہیے' سائنس سے راہنمائی حاصل کرنی چاہیے' تب ہمیں سمجھ آئے گی کہ ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ اور اس دنیا میں کیسے زندہ رہنا ہے؟ ہمارے سب سیاسی' اقتصادی' معاشرتی اور اخلاقی مسائل کا حل سائنس اور تعلیم میں موجود ہے۔ عقیدے کے دائرے کے اندر گھوم کر ہم بہت بھٹک چکے' عقیدے کے کام عقیدے سے کیجئے۔ اس دنیا کے کام اس دنیا کی سائنس سے ہی نبٹائے جا سکتے ہیں۔

ورنہ اس سوال کا سامنا کرنا ہوگا کہ کیا حب الوطنی کے لیے متعصب تاریخ ضروری ہے؟ اگر حب الوطنی کی یہی شرط ہم نے قائم رکھی تو ہم حال کے مسائل سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور مستقبل کی راہیں بھی بدستور اندھی رہیں گی' نوجوان نسل کو بھٹکا کر ہم اپنے مستقبل پر خود کلہاڑی چلا دیتے ہیں۔ یہاں اس سوال کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ کیا تاریخ غیر متعصب بھی ہوتی ہے؟ سو فیصد معروضیت اسی طرح ناممکن ہے جس طرح خالص ترین سونا بھی 9.999 کے درجے سے زیادہ خالص نہیں بنایا جا سکتا لیکن سونے اور لوہے میں غالب فرق تو رہنا چاہیے۔ ہماری لکھی تاریخ اور تعصب میں کچھ خاص فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ تاریخ کی افادیت اس وقت ممکن ہے جب اسے معروضیت کے انتہائی ممکنہ درجے پر پہنچایا جائے۔ اگر یورپ کے مورخین نے تاریخ کو غیر متعصب رکھنے کی کوشش نہ کی ہوتی تو حیات و کائنات کے بارے میں کبھی سائنسی تھیوریاں ایجاد نہ کر پاتے۔ اس دنیا کو سمجھنے کا جتنا بھی علم موجود ہے وہ صرف مغرب کے ''عیسائی اور یہودی''

مصنفین کی لکھی تحریروں سے ہی حاصل ہوتا ہے اور ساری دنیا کی یونیورسٹیاں انہی کے مہیا کردہ علم سے چل رہی ہیں۔

❖.....❖.....❖

قومی سلامتی کا ضامن تعلیم یا دفاع؟

"The Connection between
educatin and Power is too
obvious to be ignored"

(سرسید احمد خان)

ہم آئے دن مقتدر حضرات کے ایسے بیانات سنتے رہتے ہیں۔''قومی سلامتی کے سوال پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا''۔دفاع کے لیے جتنے پیسے کی ضرورت ہوگی وقف کیا جائے گا''۔ ''سلامتی کو قومی پالیسی اور بجٹ میں اعلیٰ ترین حیثیت حاصل رہے گی''۔اصولی طور پر اس سوال سے کسی شہری کو بھی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ریاست کوئی بھی ہو'اسے اپنی سلامتی عزیز ترین ہوتی ہے' ظاہر ہے قوم اور اس کے دیگر اداروں کا وجود اس وقت برقرار رہ سکتا ہے جب ریاست سلامت اور محفوظ ہو،لیکن سوال یہ ہے' کیا ریاست کی ''سلامتی'' پر ریاست کے دیگر سب اداروں اور شہریوں کی فلاح و بہبود کو ایسے قربان کیا جا سکتا ہے کہ خود ریاست کا وجود ہی بے معنی ہو جائے یا ریاست بیرونی خطرے سے تو سلامت رہے لیکن اندرونی ڈھانچے اور دیگر اداروں کی طرف عدم توجہی ریاست کو اندر سے کھوکھلا کر دے؟ تب سلامتی کے کیا معنی باقی رہ جائیں گے؟

ہم اس بات کو ایک اور مثال سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ میرے جان و مال کو میرے ہمسائے سے خطرہ ہے' چنانچہ میں اپنی سلامتی کے لیے محافظوں کا ٹولہ رکھ لیتا ہوں۔ میرا غریب اور نچلے متوسط طبقے سے تعلق ہے' لہٰذا میری آمدنی نہایت محدود اور قلیل ہے۔ میں ابھی اپنے گھر

میں ٹھیک طریقے سے بجلی، پانی، صحت وصفائی اور غذا معقول مقدار تک مہیا نہیں کر سکتے۔ میرے گھر کا فرنیچر بوسیدہ ہے اسے ابھی بدلنا ہے، بچے بڑے اور زیادہ ہو رہے ہیں، انہیں زیور تعلیم سے آراستہ کرنا ہے، لیکن میری ساری توجہ ہمسائے کے خطرے کی طرف ہر وقت مبذول رہتی ہے، میں اپنی کمائی کا زیادہ سے زیادہ حصہ محافظوں کی تعداد بڑھانے اور ان کے ہتھیاروں کی خریداری پر صرف کرتا ہوں۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے بھی بھاری سود پر قرضے لینے شروع کر دیتا ہوں۔ ماہ بہ ماہ قرضے کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے، قرضوں کی ادائیگی اور محافظوں کا خرچہ میری قلیل آمدنی پر حاوی ہو جاتے ہیں، میرے گھر کے در و دیوار مسلسل بوسیدہ اور بچوں کی حالت دگرگوں اور گھر کی ساری معاشیات دھرم بھرم ہو جاتی ہے، لیکن ہمسائے کے ساتھ دشمنی میری غیرت کا سوال ہے، میں اپنے بال بچوں کا مزید پیٹ کاٹ کر اپنے محافظوں کے خرچے میں کوئی فرق نہیں آنے دیتا۔ اب میرے گھر دوسری تیسری نسل بھی پروان چڑھنے لگی ہے، سب کا مستقبل تاریک ہوتا جا رہا ہے۔ اپنے گھر کے افراد کی بہبود میری ترجیح ہی نہیں رہتی۔ اس کے لیے نہ میرے پاس وقت ہے نہ پیسہ۔ میرے پاس دو ہی اعلیٰ ترین ترجیحات باقی رہ جاتی ہیں، بھاری سودی قرضوں کی واپسی اور اپنی آمدنی اور گھر کے حجم سے کئی گنا بڑے حفاظتی دستے کی ضروریات کو پورا کرنا۔ مقابلے بازی میں ادھر میرے ہمسائے کا حشر بھی کوئی مجھ سے مختلف نہیں ہوتا، ہم دونوں روز چھت پر چڑھ کر لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے اور عہد کرتے ہیں، کہ ایک دوسرے سے بڑھ کر محافظوں پر خرچہ جاری رکھیں گے۔ ہمیں پرواہ نہیں ہمارے بچے جاہل اور بے روزگار رہیں، بلکہ میں فخریہ اعلان کرتا ہوں کہ میرے بچے گھاس کھانے پر مجبور کیوں نہ ہو جائیں میں ہمسائے سے مقابلہ بازی سے باز نہیں آؤں گا۔ چنانچہ میں نے گھر والوں کے کپڑے بھی اتروانے شروع کر دیئے۔ ادھر بستی کے دوسرے کئی گھر دیکھتے دیکھتے ترقی اور خوشحالی کی منزلیں طے کر گئے۔ کل جو مجھ سے زیادہ غریب تھے، آہستہ آہستہ آج وہی میرے گھر آ کر میرے بزنس اور اثاثوں کو خرید رہے ہیں۔ جب میرا دیوالیہ قریب آیا تو بستی کے کئی بڑے

چودھریوں نے ہم دونوں کو آپس میں سمجھوتہ کر لینے کا مشورہ بھی دیا۔ جن بنیوں سے میں قرضے لیتا تھا انہیں بھی میری حالت پر ترس آنے لگا۔ انھوں نے بھی حفاظتی اخراجات کم کرنے کا کئی بار مشورہ دیا لیکن یہ میری غیرت کو گوارا نہ تھا۔ میں ''اصولوں پر سودا'' نہیں کر سکتا تھا۔ ہمسائے سے ''کچھ لو اور دو'' نہیں ہو سکتا اور ادھر میرا سب کچھ جا رہا تھا۔ جس سے میں مطلق لاپرواہ تھا۔ گھر کے افراد کی زبان پر گھرانے کی تباہی کی باتیں عام ہونے لگیں لیکن میں اپنا موقف بدلنے والا نہیں تھا۔ آخر وہی ہوا۔ میرے گھر کے افراد بقائے حیات کی لڑائی میں ایک دوسرے پر ہی ٹوٹ پڑے اور ایک دن گھر کی بوسیدہ دیواریں اور چھت نیچے آن پڑے۔ زمانہ میری حماقت پر ہنس رہا تھا!! میری موت دشمن کے ہاتھوں نہیں بلکہ میں اپنی بنائی قبر میں خود اتر رہا تھا۔

آیئے دیکھیں زندگی' سلامتی اور آزادی کے کیا معنی ہیں۔ زندگی ہر ذی روح کو بے حد عزیز ہوتی ہے.....فطرت کے عمل میں جس کسی کو زندگی ملتی ہے اس کی ساری تگ و تاز زندہ رہنے کے محور پر گھومتی ہے کیوں کہ ''زندگی'' ہی ذی روح کی پہچان ہوتی ہے' وہ اس کا وجود بھی ہوتی ہے اور الیغو بھی۔ ہر ذی روح فقط زندہ ہی نہیں' آزادی سے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اپنے پر پابندیاں برداشت نہیں کرتا۔ پابندیاں اس کی فطری نشوونما کو نہ صرف روک دیتی ہیں بلکہ زندہ رہنے کا سارا لطف ہی ختم ہو جاتا ہے' اس لیے ہر ذی روح اپنی زندگی اور آزادی کی برقراری کے لیے تڑپتا ہے' ذی روح مخلوقات میں انسان سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ یہ پیچیدہ ترین عضویاتی ساخت کا بنا ایک نہایت پیچیدہ ترین مادی' ثقافتی اور نفسیاتی دنیا میں زندہ رہتا ہے' جسے اس نے ''تہذیب'' کا نام دے رکھا ہے۔ تہذیب نے ایک طرف انسان کو ترقی یافتہ ثقافتی و سماجی حیوان میں بدل دیا لیکن دوسری طرف اس نے انسان کی کئی فطری آزادیاں بھی سلب کر لیں' چنانچہ انسان فطری آزادیوں اور تہذیبی شکنجوں کے بیچ و بیچ اپنی سماجی تاریخ مرتب کر رہا ہے۔ ترقی یافتہ ذہنی و فکری صلاحیتوں سے مسلح ہونے کے ناطے انسان کو زندگی اور آزادی دیگر ذی روح دنیا سے زیادہ عزیز ہے اور وہ ان کی برقراری کے لیے زیادہ شدت کے ساتھ لڑائی لڑتا ہے' لیکن زندگی اور اس کی

سلامتی وآزادی کا سوال ریاضی کے دوجمع دو کی طرح سیدھا سادہ نہیں۔انسانی دنیا بڑی پیچیدہ اور Paradoxes پر مشتمل ہے' یہاں قدم قدم پر زندگی' سلامتی اور آزادی کے معنی تبدیل ہو جاتے ہیں' بہت ممکن ہے جسے آزادی کہا جائے وہ کسی نئی زنجیروں کا نام ہو اور وہ آزادی محض کسی چھوٹے سے طبقے کے مفادات کی حفاظت کا سارا چکر ہو۔

یہ وطن ہمیں بنا بنایا نہیں ملا۔یہ اپنی جگہ ایک انوکھا تاریخی واقعہ ہے۔ورنہ قوموں کو وطن بنے بنائے ملتے ہیں ہم نے اس وطن کو کیوں بنایا؟ ''اسلام'' کے لیے بنایا' ''آزادی اور عزت نفس'' کے لیے بنایا۔جیسی غیر واضح خیالی نعرے بازی جتنی بھی کر لیں زمینی حقیقت یہ ہے کہ ہم انسان ہیں' اپنے لیے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے ایک بہتر' خوشحال اور ترقی یافتہ زندگی کی خواہش رکھتے ہیں۔غیر منقسم برصغیر میں ہمیں کچھ وجوہ کی بنا پر ایسا ہونے کی ضمانت نظر نہیں آتی تھی۔ یہ وطن تاریخ کے زبردست بحرانی ابھار کے دوران وجود میں آیا' جب مختلف قوتیں اپنے اپنے مفادات کے مطابق برسر پیکار تھیں۔جس کی وجہ سے اس وطن کے کچھ جغرافیائی خدوخال ہماری پسند اور خواہش کے مطابق نہ ڈھل سکے۔ظاہر ہے یہ ضروری نہیں تاریخ مکمل طور پر کسی کی خواہشوں کے مطابق ڈھل جائے۔ دوسری قوتیں بھی کارفرما ہوتی ہیں لیکن ہم نے' جو تھوڑا سا ناخوشگوار پہلو رہ گیا اسے اپنی قومی زندگی کا سب سے بڑا روگ بنا لیا۔اتنا بڑا شاندار جو وطن نصیب ہوا۔غنیمت جاننے کی بجائے اسے ایک فی صد نہ ملے حصے پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

چنانچہ اس نوزائیدہ وطن کی تعمیر و ترقی کے لیے جن وسائل اور بھرپور توجہ کی ضرورت تھی' وہ ہم اسے نہیں دے سکے۔اس کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کی بجائے دس گنا بڑے ہمسایہ ملک سے بقیہ ایک فی صد حصے کے حصول کو اپنی قومی زندگی کی سب سے بڑی ترجیح قرار دے دیا۔اب کیا تھا دفاع کے پھیلاؤ اور اخراجات کا مقابلہ شروع ہو گیا' چنانچہ ایک نارمل ریاست کے اندر دفاع کی جو حیثیت ہوتی ہے' اسے اس سے بہت زیادہ بڑھ کر غیر معمولی اہمیت اور تقدس مل گیا۔ پاکستان ایک پسماندہ' جاگیرداری معیشت و معاشرت کا ملک تھا۔ جسے جدید صنعتی' جمہوری اور

فلاحی ریاست میں تبدیل کرنا تھا لیکن جناح کی سب امنگیں اور عوام کے سب خواب ''ایک پیسہ ایک ٹینک'' کے جذبات آفریں نعروں میں بہہ گئے۔ عوام کی وطن سے محبت کے معنی ہی بدل گئے۔ وطن کو اقتصادی، تعلیمی، کاروباری اور صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ بنانے کا عزم اور عمل ترجیحات کی نچلی ترین سطح پر جا بیٹھے۔ ہمارے لیے پہلی اور آخری صداقت بس یہی رہ گئی، ہم دو دشمن اس خطے میں رہ رہے ہیں، یہ دشمنی ازلی اور ابدی ہے۔ آزادی کا ''نامکمل ایجنڈا'' جب تک پورا نہیں ہوتا۔ ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ہمارے سارے کے سارے وسائل صرف سلامتی کے شعبے کے لیے حاضر اور وقف ہیں۔ ناخواندہ عوام کو ایٹم بم بنانے کی رومانیت میں مبتلا کیا جا چکا ہے، جنہیں کوئی شعور نہیں کہ ہم یوں خود کو ایٹمی جنگ کی امکانی قیامت کے سپرد کر رہے ہیں۔

چنانچہ نصف صدی سے وطن جیسی عظیم نعمت کے ساتھ کھلم کھلا بے حسی کا برتاؤ جاری ہے، اسے سنوارنے اور خوبصورت بنانے کا عہد کبھی ہمارے ایجنڈے پر ترجیح نہ پا سکا۔ کسی بھی وطن اور قوم کی آن اس کے تعلیمی پھیلاؤ اور معیار سے ہوتی ہے، اس کی عزت صنعتی پیداواری صلاحیت سے کی جاتی ہے۔ قوموں کی بڑھائی عام آدمی کے اعلیٰ معیار زندگی سے ناپی جاتی ہے۔ الحمدللہ ہمیں کبھی پرواہ نہیں رہی کہ یہ قوم جاہلوں اور غربت زدہ ان پڑھ لوگوں پر مشتمل ہے۔ آج بھی اکثریتی آبادی کو بجلی، پینے کا صاف پانی، حفظان صحت کا حامل ماحول میسر نہیں۔ وسیع و عریض آبادیاں قدیم قبائلی اور جاگیرداری ماحول میں زندہ ہیں۔ جہاں 21 ویں صدی نام کی کوئی چیز نہیں، ہمیں اس وطن کی ٹوٹی پھوٹی تنگ شاہراہوں اور گرد اور دھوئیں سے اٹے بازاروں کی پرواہ نہیں کہ بے تحاشا بڑھتی آبادی کا اژدھام مستقبل قریب و بعید میں کیا حشر ڈھانے والا ہے۔ مسائل بڑھتے بڑھتے عذاب کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ ریاست بھی خود کو گمبھیر بحران میں محسوس کرنے لگی ہے، لیکن پالیسی اور قومی فکر میں انقلابی تبدیلی لانے کی بجائے عوام کے معیار زندگی کو مزید پست کرنے اور ناگزیر معمولی ترقیاتی کاموں کا مزید گلہ گھوٹنے کے سوا کوئی حل نہیں۔ عوام کے لیے یہی ہے کہ وہ ہمسائے کی دھمکیوں کی طرف توجہ مبذول رکھیں۔

ہمارا بنیادی زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ قومی زندگی' اس کی سلامتی اور آزادی کے کیا معنی ہیں۔ ہم پاکستانی ایک قومی ہیں' ہمارا ایک آزاد اور خودمختار وطن ہے۔ آخر ہماری اس قومی زندگی کے کیا مقاصد ہیں؟ کیا اس کا مقصد ہے' ہم ہمیشہ ہمیشہ اپنے سے دس گنا بڑے ہمسایہ ملک سے ٹکراتے رہیں..... اور اپنی قومی دولت اور ذرائع کو ریاست کے صرف ایک ادارے کے لیے وقف کیے رکھیں تاکہ ہم ''سلامت اور آزاد'' رہ سکیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ ادارہ ہمیں بیرونی خطرے سے ''سلامت اور آزاد'' رکھنے میں کامیاب رہے گا لیکن اس کی جو ہم ''قیمت'' ادا کر رہے ہیں۔ اس سے نہ صرف ہماری اس ''سلامتی اور آزادی'' کا کوئی مطلب نہیں رہ جائے گا' بلکہ ملک مالیاتی' اقتصادی اور اخلاقی لحاظ سے اسی قدر کھوکھلا اور دیوالیہ ہو رہا ہے کہ اس ملک اور قوم کا ایک خوفناک مستقبل تمام نسلوں کے اعصاب پر سوار ہو کر اسے خانہ جنگی اور کرپشن کے تباہ کن انجام کی طرف لے جا رہا ہے۔ قومی زندگی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر آنے والی نسل کے لیے بہت بہتر ماحول کو یقینی بنایا جائے' انہیں زندہ رہنے کے بہت امکانات میسر آئیں۔ برے مستقبل اور غیر یقینی کے خوف میں زندہ رہنا کیا ''سلامتی اور آزادی'' کہی جا سکتی ہے' ایک ایسے ماحول میں جہاں چار سو پس ماندگی' افلاس اور جہالت منہ چڑا رہی ہو' ایسی ''سلامتی اور آزادی'' پر کون فخر کرے گا۔ سوائے ان کے جو مروجہ نظام سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اس بات سے اختلاف نہیں کہ دفاع پر اتنا زیادہ کیوں خرچ کیا جا رہا ہے' بلکہ اپنی جگہ پر دیگر حکومتی اداروں کی طرح وہ بھی پیسے کی قلت کے مسائل سے دوچار ہیں۔ معقولیت کا تقاضا تھا کہ قومی دولت ترجیحی طور پر پیداواری سیکٹر میں لگتی' تاکہ ملک پہلے قومی دولت کی وسیع تر پیداوار کے قابل بنتا۔ ہم نے دولت پیدا کرنے والے ذرائع اور وسائل (صنعت' زراعت او تعلیم) پر پیسہ صرف کرنے کی بجائے اپنی قلیل قومی دولت غیر پیداواری سیکٹر پر صرف کر دی' گویا ہم نے وہ شاخ ہی کاٹ دی جس نے مستقبل میں ملک کے سب اداروں کی ترقی اور خوشحالی کا باعث ہونا تھا۔ ہمیں سوچنا چاہیے' کہ پچاس سال سے یہ وطن علاقائی تناؤ کی سولی پر لٹکا ہے۔ تین جنگیں اور

ایک بڑی خانہ جنگی کو پا کر ہم نے کیا حاصل کیا ہے' مستقل ''نہ جنگ اور نہ امن کی کیفیت'' ہر لحاظ سے قوم کے لیے تباہ کن ہے۔ وطن کی آزادی کا ساٹھ سال سے زائد عرصہ محض دشمنی نبھانے میں ضائع ہو چکا ہے۔ اگر یہی عرصہ اور وہ وسائل جو ہم نے دفاع اور جنگوں پر لگائے۔ اس ملک کی تعمیر و ترقی میں لگے ہوتے تو پاکستانی اقتصادیات اتنی دولت پیدا کر رہی ہوتی کہ یہی ہمارا دشمن ہمیں حسرت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوتا۔ بھاری سودی عالمی قرضوں اور اپنی ترقی کے ذرائع کو تباہ کر کے مانگے کے ہتھیاروں سے کسی قوم کا دفاع مضبوط نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے پچاس سال میں دفاعی اخراجات کو بجٹ کے ٹاپ پر رکھنے سے اندرونی قومی سلامتی داؤ پر لگی بیٹھی ہے۔ ریاست' سماج اور تہذیب کے سب ادارے نہایت پس ماندہ اور لنگڑے لولے ہو گئے ہیں' معیشت اور سائنسی ترقی نے آگے چل کر دفاع کو Feed کرنا تھا۔ ہماری الٹی ترجیحات نے انہیں ہی چوس کر رکھ دیا۔

کسی ملک کی آزادی اور خودمختاری کا کوئی مطلب باقی نہیں رہ جاتا' اگر اس کے اپنے باسیوں کے پھلنے پھولنے کے امکانات سلب ہو جائیں۔ زندگی کی سلامتی اس لیے چاہی جاتی ہے کہ زندگی کو بھرپور طریقے سے گزارا جا سکے' لیکن اگر ''سلامتی'' کا مطلب گھٹ گھٹ کر جینا ہو تو ایسی سلامتی محض فریب بن کر رہ جائے گی' لہٰذا ہمیں سب سے بڑا مسئلہ ''سلامتی'' کو نہیں ''ترقی'' کو بنانا چاہیے اور سلامتی کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ قوم کی ترقی کے اس عمل میں کوئی رکاوٹ نہ آنے پائے۔ ہمارے ہاں اس کے برعکس ہو رہا ہے۔ کروڑوں لوگوں کی فلاح و بہبود اور ان کی خوشحالی سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں اور ہم نے اسے مشروط کر رکھا ہے کہ جب تک ہمسایہ ملک کے قبضے سے ایک چھوٹے سے رقبے پر مشتمل علاقہ ہمارے ساتھ آ نہیں ملتا۔ اس علاقے میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا قومی وسائل کا خطیر حصہ دفاع کے لیے مختص رہے گا۔ پچھلے پچاس سال کا تجربہ و مشاہدہ بتاتا ہے کہ یہ صورت حال آگے کی کئی نصف صدیاں مزید کھا جائے گی۔ کیا یہ اس ملک کے ساتھ ظالمانہ مذاق نہیں جسے اتنی بڑی قربانیوں سے حاصل کیا گیا کہ اس کی تعمیر و ترقی کو غیر معینہ مدت

تک کے لیے موخر کرنے کا اعلان کر دیا جائے اور اس پر معاشرے کے تمام طبقے تالی بجانے پر مجبور ہوں کہ اس کا نام حب الوطنی ہے۔ کوئی بھی پالیسی اور نظام ہو' کچھ لوگوں کے مفادات اس کے ساتھ پیوست ہو جاتے ہیں اور یہی Vested Interests اسے بدلنے نہیں دیتے' سلامتی کے شعبے پر مسلسل غیر متناسب خرچے کی وجہ سے اندرونی اور بیرونی قرضوں کی ادائیگی (Debt Servicing) اور ان کے مزید حصول کا ایک خوفناک بھوت قومی معیشت کے سر پر آ بیٹھا ہے' گویا یک نہ شد دو شد اب محض انتظار باقی ہے کہ کس دن اس ملک کے کرتا دھرتا قوم کو ملک کی مکمل تباہی کی خبر دیتے ہیں۔ قومی اثاثوں اور صنعتوں کو نیلام عام میں بیچ کر کتنے دنوں کا ''خسارہ'' پورا ہو سکے گا۔ اگر خسارے کی موجب یہی پالیسی مسلسل جاری رکھی جائے گی۔

بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہم تعلیم کو اپنی سب سے بڑی ترجیح بنا لیں۔ پوری قوم یک نکاتی ایجنڈا بنا لے کہ ہمیں تمام انفرادی' اجتماعی اور قومی وسائل صرف اور صرف تعلیم کے لیے وقف کرنے ہیں' ناخواندگی کا نام و نشان مٹانا ہے۔ تعلیمی سہولتوں' اداروں اور ان کے معیار کو ترقی یافتہ قوموں کے مقابل لانا ہے۔ تعلیمی اخراجات کا سوال سامنے آئے تو وہ ایسے ہی ناقابل سمجھوتہ ہونا چاہیے جیسے پچھلے پچاس سال سے ہماری کمٹمنٹ سلامتی کے شعبے سے رہی ہے۔ ہماری خوشحالی' ترقی اور سلامتی کی سب راہیں صرف تعلیم اور تعلیم ہی کھول سکتی ہے۔ تعلیم سے بڑا پیداواری سیکٹر اور کوئی نہیں۔ ہمارے تمام انفرادی' سماجی اور قومی مسائل کا حل صرف تعلیم کے فروغ سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم ہمارے مزدور اور کسان کی پیداواری صلاحیتوں کو کئی گنا بڑھا سکتی ہے' پیداوار بڑھے گی تو عوام کا معیار زندگی بڑھے گا۔ جہالت تو ہم پرستی' ملائیت' مذہبی فرقہ واریت کا خاتمہ ہوگا۔ شرح آبادی میں اضافے کی رفتار تعلیم کے آنے سے رک جائے گی۔ عورتوں کے تعلیمی اور پیشہ وارانہ سرگرمیوں میں آ جانے سے کم عمری کی شادیاں بھی رکیں گی اور عورت کی زندگی کا مقصد صرف بچے پیدا کرنا اور پالنا نہیں رہے گا۔ تعلیم ہوگی تو ہمارے ہاں صنعت فروغ پائے گی' جدید فنون و علوم سے واقفیت رکھنے والے ہنرمند ورکرز پیدا

ہوں گے۔ زمین میں چھپے قدرتی وسائل کی تلاش اور ان کی صنعت میں منتقلی کا کام تیز ہو سکے گا۔ تعلیم معیار زندگی کو بڑھائے گی تو ہمارے شہر اور گاؤں دیہات کی بستیاں بھی صاف ستھری ہونے لگیں گی۔ تعلیم سے ہمارے قومی تفاخر اور اعتماد میں اضافہ ہوگا' ہم پاکستانی سر اٹھا کر دنیا کی قوموں کا سامنا کر سکیں گے۔ ہم عالمی بھکاری نہیں رہیں گے۔ دنیا کو علوم وفنون ایکسپورٹ کرنے کے اہل بن جائیں گے۔ تعلیم آنے سے ہمارے عوام کی عمومی خستہ حالی خوشحالی میں تبدیل ہو جائے گی۔ عوام تعلیم یافتہ ہوں گے تو سیاسی اور جمہوری بحرانوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا' قانون کی صحیح معنوں میں حکمرانی آئے گی۔ شخصیت پرستی' آمریت' فیوڈل سوچ' بیوروکریسی کی کرپشن' پیشہ ور سیاسی خاندانوں کا خاتمہ ہوگا۔ تعلیم یافتہ باشعور عوام کے سامنے حکمران قومی دولت کی لوٹ مار نہیں کر سکیں گے۔ ہمارے ہاں مختلف طاقت ور طبقے قومی دولت کو اس لیے لوٹتے رہتے ہیں کہ ان کو پتہ ہے عوام ان پڑھ' جاہل اور بے بس ہیں۔ ہمارے اس دانشور کی بات غلط ہے کہ اس ملک کو تعلیم یافتہ طبقے نے لوٹا ہے' سچ یہ ہے کہ یہ ملک اس لیے لٹا جا تا رہا ہے کہ عوام غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ تعلیم یافتہ معاشرے مہذب اور قانون کی پاسداری کرنے والے معاشرے ہوتے ہیں' قانون کی پامالی صرف جاہل معاشروں میں ہی ممکن ہوتی ہے۔ نہایت قلیل' ادھوری' غیر معیاری اور لنگڑی لولی تعلیم سے معاشرے کو کیا فیض مل سکتا ہے۔ تعلیم علم اور خوبصورتی کا نام ہے۔ آج کے معیار انسانیت پر صرف تعلیم سے ہی پہنچ سکتے ہیں' ورنہ غیر تعلیم یافتہ فرد جانور سے بدتر ہے۔ یہی وجہ ہے' ہمارے ہاں نیچے سے لے کر اوپر تک جنگل کا قانون چلتا ہے۔ طاقت ور کا قانون' کمزور کو کچل دینے کا قانون۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کا مطلب غیر تہذیب یافتہ ہونا ہے اور اگر ہم غیر تہذیب یافتہ ہیں تو پھر دنیا میں ہماری عزت کیسے ہو سکتی ہے۔ ہم دنیا کی منڈی میں فقیر اور سستے (Cheep) لوگ ہیں' ہم سستے ہیں' ہماری محنت سستی ہے۔ ہم سستی چیزیں بناتے ہیں' ترقی یافتہ ہمیشہ مہنگا ہوتا ہے، خواہ وہ پراڈکٹ ہو یا انسان۔ مہنگے کی عزت ہوتی ہے' سستی چیز کو حقیرانہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے' اس سے لاپروائی کی جاتی ہے'

جعلی اناؤں پر ہم کب تک زندہ رہیں گے' حقیقت یہ ہے ہم ترقی یافتہ اقوام کے مقابلے میں نہایت بے وقار لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں ظلم کی وہ بھیانک شکلیں موجود ہیں' کہ ہمیں خود کو انسان اور انسانی معاشرہ کہنے کا کوئی حق نہیں' ہم اپنی اور دنیا کی نظروں میں عزت صرف تعلیم یافتہ بن کر ہی حاصل کر سکتے ہیں' ہمارے تمام روحانی' نفسیاتی' سماجی اور سیاسی مسائل کا علاج صرف اور صرف تعلیم میں مضمر ہے' ہمیں تعلیم سے زیادہ عزیز کوئی شعبہ نہیں ہونا چاہیے۔ تعلیم ہوگی تو زندگی کے سب شعبوں میں بہار آ جائے گی' ہماری عزت' زندگی' اور سلامتی تعلیم سے وابستہ ہے۔ تعلیم ہوگی تو ہم ترقی کریں گے' ترقی ہوگی تو دولت میں اضافہ ہوگا' دولت میں اضافہ ہوگا تو ہم دفاع پر زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کے قابل ہوں گے' ورنہ ہم کتنا بھی اپنی افواج کی صلاحیت پر اترائیں۔ وہ ایک پس ماندہ ملک کی غریب الحال افواج ہی رہیں گی۔ مستقبل کی کئی نسلوں کا خون نچوڑ کر ادھار کی سیکنڈ ہینڈ دفاعی ٹیکنالوجی خرید بھی لی جائے' اس سے ہماری افواج ترقی یافتہ اقوام کے مقابل تو کھڑی نہیں ہوسکتی اور نہ ہی ملک کو ٹوٹنے سے بچا سکی۔ اصل طاقت و قوت کا سرچشمہ کسی قوم کی معیشت ہوتی ہے اور معیشت تعلیم کے بغیر نہ فروغ پا سکتی ہے نہ ترقی کر سکتی ہے۔ ہمارے عوام نے نصف صدی ابنارمل حالات میں گزار دی ہے' ہمیں سوچنا ہوگا کہ یہ کن عناصر کے مفاد میں ہے' جو پاکستان کو 1947ء سے آگے نکلنے نہیں دے رہے۔ ہم کب تک 1947ء میں پھنسے رہیں گے۔ ہمیں مان لینا چاہیے کہ پاکستان آج اقوام عالم میں ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت رکھتا ہے نہ تو دنیا میں لوٹ مار مچی ہے کہ کوئی ملک اٹھ کر ہمسایہ ملک پر قبضہ کر لے اور نہ ہی پاکستان کے کروڑوں عوام کے سامنے کسی دشمن کو جرات ہوسکتی ہے کہ وہ ہماری سرزمین کا ایک ذرہ بھی اٹھا کر لے جائے۔ البتہ اپنے علاقے میں کشیدگی کا ماحول ہمارے لیے زہر قاتل ہے' ہمیں اب اپنی نفسیات بدلنی ہوگی۔ نئی حکمت عملیاں بنانی ہوں گی' جو ہمیں خوشحال بھی بنائیں اور طاقت ور بھی۔ آج تک ہم نے طاقت کے نام پر خود کو کمزور کیا ہے' اس سے پہلے کہ ہم اپنے ہاتھوں خود ہی ختم ہو جائیں' ہمیں فوراً اپنی قومی ترجیحات موڑ

دینی چاہئیں ہمیں قومی سطح پر کوئی ایسی بات اور پالیسی اختیار نہیں کرنی چاہیے' جو اس خطے میں کشیدگی' اسلحے کی دوڑ کا باعث بنے۔ ہمیں اپنی خارجہ پالیسی اور اہداف میں تبدیلیاں پیدا کر کے دفاع کے اوپر بوجھ کم کرنا چاہیے۔ اپنی زندگی سے بڑا اور کوئی اصول نہیں ہوسکتا۔ اصول زندہ رہنے کے لیے ہوتے ہیں' حساب اور منطق کی بات ہے چند لاکھ لوگوں کی آزادی کے لیے کیا 18 کروڑ لوگوں کی آزادی کو بے معنی بنایا جا سکتا ہے اور معاملے کو یوں صدیوں تک طول دیا جائے کہ نہ ان چند لاکھ لوگوں (کشمیریوں) کا کوئی بھلا ہو اور نہ ہی کروڑہا لوگ چین کی زندگی بسر کر سکیں۔ اصولوں پر اختلاف ہے تو وہ ہونا بھی چاہیے' لیکن اس کے لیے قوم اور ملک کا مستقبل اس کی ترقی کا سارا عمل ہی تباہ کر دیا جائے' یہ کہاں کی دانشمندی ہے۔ ایمرجنسی ایک عارضی عمل ہوتا ہے' ہمارا ملک پچاس سال سے ایمرجنسی میں ہے' صرف اضطراری حالات میں ہی زندگی کے سب شعبے معطل ہو جاتے ہیں' ہمیں نصف صدی سے زائد عرصہ اپنی قوم کے تمام شعبوں کو معطل کر کے سلامتی کے شعبے کو اعلیٰ ترین ترجیح دے رکھی ہے۔ کیا یہ ہمارا نارمل رویہ ہے' کیا ہماری سب نسلیں ایمرجنسی کے حالات میں ہی ختم ہوتی رہیں گی؟

افرادی قوت (Man Power) ہمارے جیسے ترقی پذیر ملک کی سب سے بڑی دولت ثابت ہوسکتی ہے' ایک ناخواندہ' خستہ حال اور غیر تربیت یافتہ فرد سے صلاحیت پیداوار (Productivity) کی کیا توقع کی جاسکتی ہے' کروڑوں افراد کی قوت اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی افرادی قوت پر سرمایہ کاری کریں' انہیں جدید علوم اور گوناگوں ہنروں (Skills) سے لیس کریں' ہم پس ماندہ اور غریب قوم ہیں۔ لیکن اس قوم کا کوئی بھی شخص ہمیشہ کیلئے خود کو ایک مفلوک الحال ملک کے فرد کے طور پر دیکھنا نہیں چاہتا وہ اپنے وطن کو بھی ترقی یافتہ دیکھنا چاہتا ہے اور خود بھی خوشحال ہونا چاہتا ہے' اب مزید علاقائی کشیدگی اور سلامتی پر غیر متناسب اخراجات کا بوجھ قوم اور ملک دونوں کے لیے خودکشی کے مترادف ہوگا۔ ہم نے ترقی یافتہ ہونا ہے' دیگر ''قومی مسائل'' ہم بعد میں دیکھیں گے۔ اگر صرف دس سال دفاع

کے برابر پیسہ تعلیم کے شعبے پر لگا دیا جائے تو پوری قوم کی قسمت اور صورت بدلی جا سکتی ہے اور پاکستان کی سلامتی اور آزادی بھی کئی گنا زیادہ محفوظ ہو جائے گی۔

❖.....❖.....❖

کچھ مباحث تعلیم

سوال کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم کے نام پر جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے' کیا وہ آج کے زمانے کے لحاظ سے موزوں' مفید اور برمحل (Relevant) ہے یا نہیں؟ اگر ہمارے مدرسوں میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ برمحل نہیں ہے تو اسے تعلیم بھی نہیں کہا جا سکتا۔ نوجوان کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم بے محل (Irrelevant) ہے' کیونکہ موجودہ تعلیم کا مطلب ہے صرف وہ کچھ جو اسٹیبلشمنٹ کے بزرگ ان تک پہنچانا چاہیں نہ کہ جسے وہ چاہتے ہیں یا جس کی انھیں ضرورت ہے۔

تعلیم کے اس سارے عمل کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ''معاشرہ یا اس کے نمایندگان ایک ایسے طریقہ سے' جسے وہ معاشرہ مناسب سمجھتا ہے' کے ذریعے نوجوان نسل میں وہ میلانات پیدا کرتے ہیں جو اس معاشرے کو مطلوب ہوں۔''

لیکن یہاں پر ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے' اس کا تعین کون کرے؟ معاشرے کے نوجوان یا بزرگ' کہ کون سے میلانات (Dispositions) مطلوب ہیں اور کون سا طریقہ تعلیم اطمینان بخش ہے' ظاہر ہے نوجوان' بزرگوں کا بنایا تصور تعلیم مسترد کر سکتے ہیں اور بزرگوں کو نوجوانوں کا نظریہ تعلیم قابل قبول نہ ہوگا کیا یہ جنریشن گیپ (Generation Gap) کا مسئلہ ہے یا فرد بمقابلہ سماج کا؟ ترقی پذیر معاشروں میں بمقابلہ سماج فرد کی ذات اور اس کی فطری ضروریات کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ سماج کے لیے یہی پیش نظر ہونا چاہیے کہ اس کے نوجوان ارکان (تمام افراد) کو بہترین زندگی میسر آئے' اس اصرار کے ساتھ کہ ہر فرد دوسروں کے ساتھ

اپنے اخلاقی معیار کو بلند رکھے۔ ہیگل کا کہنا تھا کہ فرد کی ذاتی روح خالی اور غیر مکمل رہ جانی چاہیے اگر وہ معاشرے کی ''معروضی روح'' کی ترقی میں شریک نہیں ہوتا جو اس معاشرے کی زبان' آرٹ' سائنس' تاریخ' ریاضیات' اخلاقیات وغیرہ کی شکل میں موجود ہوتی ہے۔

تعلیم کا مقصد طالب علم کو آرٹ' تاریخ' سائنس اور اخلاقیات کے بارے معاملہ فہم' سرگرم اور آزادانہ طور پر سوچ و بچار کے قابل بنانا ہے۔ جو کچھ پہلے موجود ہے اسے طلباء تک پہنچانا ہوتا ہے کیونکہ وہ آگے کچھ نہیں کر سکے گا اگر وہ اس پر عبور حاصل نہیں کرتا جو پچھلی نسلوں سے ملا اثاثہ ہے۔ نوجوان کے اندر تخلیقی صلاحیت اسی وقت پیدا ہوگی جب اس کے پاس اتنا علم ہو کہ سامنا ہونے پر وہ حقیقی مسئلے کی شناخت کر سکے۔ کل جب زندگی کی نئی صورتیں' نئے خیالات اور نئی روایات سامنے آئیں' کل معیار جب آج سے مختلف ہوں تو نئے اطوار حیات اور نئی سرگرمیاں پیدا ہوں۔ تعلیم نے بدلتے مستقبل کے لیے نوجوانوں کو تیار کر رکھا ہو۔ پروفیسر William Frankena کے مطابق خود اختیاری (Autonomy) تعلیم کا بنیادی مطمع نظر ہونا چاہیے' یعنی طالب علم کو آزادانہ عمل' فیصلہ اور سوچنے کے قابل بنایا جائے' چنانچہ تعلیم یافتہ شخص کہلائے جانے کے لیے Authenticity اور Rationality کی دو صفات کا موجود ہونا شرط ہے' یعنی تحقیق اور تصدیق کے بعد مستند بات کرے اور اس کے افکار مبنی بر عقل ہوں۔ ہمارے ہاں پڑھے لکھے جاہلوں کی بھرمار اسی لیے زیادہ ہے' کہ ہمارے تعلیمی ادارے تعلیم دیتے وقت مذکورہ بالا معیار کو سامنے نہیں رکھتے اور کاغذی ڈگریاں بانٹ رہے ہیں' اسی لیے معاشرہ مادی اور روحانی طور پر ترقی کی بجائے ثقافتی گھٹن کا شکار ہے' تعلیمی اداروں کے باہر اور اندر جہالت کا موسم ایک جیسا ہے' حیات و کائنات کے بارے میں ''تعلیم یافتہ'' افراد کے نقطہ نظر اور غیر تعلیم یافتہ افراد کی سوچ میں کم ہی فرق پایا جاتا ہے۔

تاریخی طور پر کوئی بھی ثقافت صاحب اثر بالا طبقات (Elites) کے غالب مفادات کے مطابق بنی ہوتی ہے۔ موجود نظریات انہی تعصّبات پر مبنی ہوتے ہیں' جو ان بالا طبقات کے اندر

خلقی طور پر (Inherently) پائے جاتے ہیں، وہ کسی آزمائش اور خطا (Trial and Error) کے معروضی عمل کا نتیجہ نہیں ہوتے لیکن اٹانومی کا یہ مطلب نہیں کہ روایت کو یکسر مسترد کر دیا جائے، بلکہ اس میں سے ان اجزاء کا محتاط انتخاب کرنا ہے جس سے طلباء کی خود مختارانہ فکر میں بھی کوئی رکاوٹ نہ ہو اور سماجی تعصّبات کی تصحیح بھی ممکن ہو سکے۔ لیکن اس تصحیح کے لیے روایتی سوچ، احساسات اور عمل کے مقابل ایک ریڈیکل متبادل کی ضرورت ہے، جسے ترغیبی انداز سے پیش کیا جا سکے۔

تعلیم کی جمالیاتی جہت

ترقی پذیر معاشرے میں جمالیاتی حسوں کو اجاگر کرنے کی ضرورت اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ صدیوں کے افلاس، پسماندگی اور شدید طبقاتی استحصال نے عوام کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کے دروازے بند کر رکھے ہوتے ہیں، چنانچہ اعلیٰ آرٹ، اعلیٰ فکر و ادب اور دیگر جمالیاتی وسائل ایک چھوٹے سے ایلیٹ طبقے تک محدود ہو جاتے ہیں۔ ترقی یافتہ معاشروں میں جہاں تعلیم عام ہے، وہاں ایک وسیع تر روشن خیال معاشرہ (Enlightended Mass Society) تعمیر پا رہا ہے، لیکن ترقی پذیر معاشروں میں جمالیاتی حظ دینے والے ذرائع نہ صرف محدود ہوتے ہیں، بلکہ انسان کی جمالیاتی حسوں کی تسکین کے عمل کو خلاف مذہب بھی قرار دے رکھا ہوتا ہے۔ یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ عوام کے لیے فکری اور سیاسی اطاعت شعاری والا علم اور پیشہ ورانہ تربیت ہی کافی ہے، زیادہ سے زیادہ ان کی جمالیاتی ضرورتیں فوک (Folk) آرٹ پوری کر دے گا، جس کی تحسین و تسکین کے لیے کسی خصوصی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں تعلیم کے صرف ادراکی اور اخلاقی پہلو پر زور دیا جاتا ہے، جمالیات پر نہیں، چنانچہ طلباء کی قوت متخیلہ فروغ پاتی ہے نہ ان کی پرواز فکر ترقی کرتی ہے۔ حکمران طبقے اور ان کے نظریاتی محافظ (ملا) مطمئن رہتے ہیں، کیونکہ اگر عوام کی حسن و جمال کی فطری حسین بیدار ہو گئیں تو وہ خوبصورت ماحول کے طلب گار ہوں گے

اوراپنے سماجی اور ثقافتی پنجروں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ان کے اندر تخیلی اور تخلیقی قوت بیدار ہوئی تو وہ جمالیات کی نئی سے نئی منزلوں کی طرف رواں ہوجائیں گے۔علم وہنر کے خوبصورت شاہکاروں پر ایلیٹ طبقے کی اجارہ داری باقی نہ رہے گی۔ عامتہ الناس افکار کہنہ کے جال توڑ کر باہر نکل جائیں گے' چنانچہ وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ تعلیم کو ادب' آرٹ' رقص' پینٹنگ' میوزک' ڈرامہ اور فن مجسمہ سازی وغیرہ سے پاک رکھا جائے۔نوجوانوں میں خوبصورت تصور زندگی پیدا ہی نہ ہوسکے' خشک نصابی کتابوں کی بوریت کے مارے نوجوانوں کی عملی اور فکری سرگرمی کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا' ان کی ساری ذہنی (Intellectual) مشق مولویانہ مسائل وعقائد تک محدود ہوکر رہ جاتی ہے۔

میرا بیٹا حیران ہوتا ہے کہ اس کے کلاس فیلو کے پاس بات چیت کرنے کے موضوع اتنے محدود کیوں ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے یہی پوچھتے رہتے ہیں' کہ تم نماز پڑھتے ہو یا نہیں' پڑھتے ہو تو کتنی' فلاں فلم دیکھی..... یا پھر کرکٹ کے کھلاڑیوں کی کارکردگی موضوع بحث بن جاتی ہے انھیں آج کے انسان کی لامحدود فکری اوجسمانی سرگرمیوں کا علم کیوں نہیں' انہیں ادب' آرٹ اور ٹیکنالوجی کی دنیا میں ہر آن پیدا ہوتے انقلاب کی خبر کیوں نہیں جمالیاتی فنون سے عاری ہمارے مدرسے روشن خیال نوجوانوں کی بجائے ''دولے شاہ کے چوہے'' پیدا کررہے ہیں۔قوت تخیلہ ترقی نہیں کرے گی تو احساسات بھی بیدار نہ ہوں گے۔معاشرے میں بے حسی پیدا ہوجائے گی اور بے حسی عمل پر مائل ہونے سے روکتی ہے۔ جمالیاتی تجربہ لذت انگیز ہوتا ہے' وہ حس تصور (Perception) کو بڑھاتا ہے' اور یہی حس تصور ہمارے اندر رضا کارانہ عمل پیدا ہونے کی امنگ پیدا کرتا ہے۔ہمیں دوسرے لوگوں اور ماحول سے محبت ہوسکتی ہے' جو ہمارے اندر انہیں خوبصورت دیکھنے کی اکساہٹ پیدا کرے گی۔ہمیں اپنے نصاب (Curriculum) میں جمالیاتی فنون کو جگہ دینی ہوگی' کہ جو کام آرٹ اور جمالیاتی حس (Perception) کرسکتی ہے' وہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم نہیں کرسکتی۔اگر ہم لوگوں کو وسیع النظر' وسیع القلب اور شریف النفس بنانا اور

اپنی ثقافت کو اعلیٰ منزلوں پر لے جانا چاہتے ہیں تو تعلیم میں آرٹ کا پڑھانا نہایت ضروری ہے۔

تعلیم میں حقوق وفرائض کا مسئلہ

انسانی حقوق کے عالمی اعلان نامہ کی شق نمبر 26 میں لکھا ہے۔ ''تعلیم پر ہر ایک کا حق ہے'' اور آرٹیکل نمبر 22 میں مزید وضاحت یوں کی گئی ہے۔ ''ہر انسان کے معاشی' سماجی اور ثقافتی حقوق کی تکمیل ہونی چاہیے جو اس کے وقار اور شخصیت کی آزادانہ ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے''۔

فلاسفروں اور ماہرین تعلیم کے ہاں حق تعلیم کے سوال پر بھی ہمیں خوب بحث ومباحثہ ملتا ہے۔ تعلیم اگر ہر ایک کا حق ہے تو اس کے مقابل کسی کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ تعلیم مہیا کرنے کے لیے وسائل مختص کرے' تا کہ یہ حق ہر ایک تک پہنچ سکے۔ دوسرے تعلیم اگر حق ہے تو پھر اس حق کو مانگنا بھی چاہیے' اب بچہ تو اس قابل نہیں کہ وہ اپنے اس حق کا دعویٰ کر سکے' چنانچہ ریاست' ماں باپ اور اساتذہ سب ذمہ دار ہیں کہ وہ بچے کو تعلیم دینے کا اپنا فرض ادا کریں۔ بچے تک تعلیم کا حق پہنچانے میں جو معاشرہ کوتاہی کرتا ہے وہ ایک جگہ رک جاتا ہے اور اس کا مستقبل ماضی سے مختلف نہیں ہوتا۔ بچے کا تعلیم پر ایسے ہی حق ہے جیسے اس کی دیکھ بھال کرنے اور غذا پہنچانے کا حق .....اس طرح کی دیکھ بھال کرنے کا مقصد بچے کو خود اپنی دیکھ بھال کرنے اور اپنی زندگی گزارنے کے قابل بنانا ہوتا ہے۔ بچے کی استعداد اور صلاحیتوں کو بڑھانا بھی اتنا ہی اہم ہے' جتنا اس کی صحت کا خیال رکھنا۔ دیکھا گیا ہے کہ ہر بچے تک معیاری تعلیم کی سہولتیں پہنچنے کی وجہ سے ترقی یافتہ معاشروں میں ان کے سمجھنے بوجھنے کی بنیادی صلاحیت میں بے حد اضافہ ہو چکا ہے۔

ماہرین کا یہاں تک کہنا ہے کہ اپنے بچوں کو ہی تعلیم دینا فرض نہیں بلکہ دوسروں کے بچوں کو بھی تعلیم مہیا کرنا ہر شخص کو اپنا اخلاقی فرض سمجھنا چاہیے' وہ بچے جن کے ماں باپ نہیں ہوتے یا وہ بچے جو ذہنی یا جسمانی معذوری کا شکار ہیں' ان تک تعلیم کی سہولتیں پہنچانا معاشرے کا فرض ہے چونکہ اس بچے کی جانب سے حکومت کو مداخلت کا حق ہونا چاہیے' جس کے والدین اسے تعلیم مہیا

نہیں کر رہے' والدین پر قانونی پابندی ہونی چاہیے کہ وہ بچے کو اسکول بھجوائیں اور اس پر اٹھنے والے اخراجات برداشت کریں' چنانچہ اسکول میں حاضری کا لازمی قانون (Compulsory School Attendance Law) پاس ہونا چاہیے۔

ہر بچہ مستقبل کا شہری ہوتا ہے' کل کو اپنے معاشرے کے بالغ ارکان میں شامل ہونا ہوتا ہے' اسے کل کو ووٹ ڈالنے اور سیاسی سرگرمیوں میں شریک ہونے کا حق ہوگا۔ اپنے ان حقوق کو استعمال کرنے اور اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے کم از کم سطح تعلیم کا حصول ضروری شرط ہے' جب آپ کی اکثریتی آبادی ناخواندہ ہوگی تو آپ ان سے کس طرح توقع کر سکتے ہیں کہ لوگ معاشرے کو آگے لے جانے میں کوئی فعال کردار ادا کر سکیں گے۔ تعلیم کے بغیر کوئی معاشرہ جمہوری نہیں بن سکتا' کاروبار حکومت اور وسائل مملکت پر فیوڈل' سرمایہ دار اور سول و ملٹری بیوروکریسی کے ایک چھوٹے سے گروہ کا بلاشرکت عوام قبضہ رہے گا' جو فطری طور پر اپنی جیبیں بھرنے کے سوا کوئی اور کام نہ کریں گے۔

تعلیم کے بغیر عوام کے سیاسی حقوق ایک فریب کے سوا کچھ نہیں ہوتے اور ضروری سطح تعلیم کی یقینی فراہمی کے بغیر ادائیگی فرائض کی توقع عبث ہے چنانچہ حق تعلیم کی فراہمی کے بغیر وسیع تر سیاسی اور سول حقوق اپنے معنی اور قدر کھو دیتے ہیں ہر ایک کے لیے تعلیم مہیا کرنے کا حق بھی ایسے ہی ہے جیسے ملزم کو قانونی امداد فراہم کرنے کا حق.....اگر وہ خود بندوبست نہیں کر سکتا تو پبلک (سرکار) کا کام ہے کہ اسے قانونی امداد فراہم کرے' کسی ایک فرد کے پڑھنے سے پوری سوسائٹی فائدہ اٹھا رہی ہوتی ہے۔ اس لیے ہر ایک کے لیے تعلیم کا حصول ممکن بنانا ہم وطنوں کا مشترکہ فریضہ ہے۔ تعلیم کے فوائد کو ان گنت طریقوں سے گنا جا سکتا ہے اگر ہم ان فوائد کو اپنانا چاہتے ہیں تو قوم کو تعلیم پر پیسہ بھی خرچ کرنا پڑے گا۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کم از کم کتنی تعلیم ہر ایک کا حق ہے؟ دراصل بنیادی تعلیم اتنی ہونی چاہیے کہ ایک فرد کو اتنی صلاحیتیں مل جائیں جنھیں وہ موثر طور پر استعمال کر سکے اور باقی تعلیم اگر چاہے تو از خود حاصل کر سکے۔ کم از کم تعلیم اتنی رکھی جائے کہ ایک

شخص اپنی دلچسپی کو دریافت کر سکے اور اگلی تعلیم کی متنوع شاخوں میں سے کسی ایک شاخ میں اپنی فطری رغبت کا اظہار کرنے کے قابل ہو سکے۔ ظاہر ہے حکومت کی امدادی رقوم (Subsidized) کی حامل اعلیٰ تعلیم پر ہر ایک کا حق نہیں ہوسکتا اس کا انحصار معاشرے کی ضروریات پر بھی ہے اور فرد کی قابلیت پر بھی۔ گو ہر انسان کا حق ہوسکتا ہے کہ وہ تعلیم کے اعلیٰ ترین درجے تک پہنچنے کی خواہش اور کوشش کرے جس کا وہ اہل ہے قوم کی امدادی رقوم کے سہارے چلنے والی تعلیم پر تمام شہریوں کا مساویانہ حق صرف ایک خاص سطح تک ہی ہوسکتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ صرف زبانی کلامی تعلیم پر ہر ایک کا حق تسلیم کر لینا کافی نہیں' کوئی بھی حق ہو وہ اپنی قدر اور حیثیت کھو دیتا ہے' اگر اس کے موثر استعمال کے لیے مناسب سہولتیں اور حالات فراہم نہ کیے جائیں اور اگر کسی کو تعلیم کا حق نہ ملے تو وہ دوسرے حقوق سے بھی محروم ہو جائے گا۔ اگر پاکستان کے حوالے سے دیکھیں تو ہم ہرگز ایک مہذب قوم کہلانے کے حقدار نہیں ہیں۔ اس لیے کہ اس کی اکثریتی آبادی تعلیم کے حق سے محروم ہے۔ نتیجہ کے طور پر تمام جمہوری اور انسانی حقوق سے عملاً محروم ہے۔ اس لیے تعلیمی مواقع میں وسعت کا مطالبہ سیاسی اقتدار میں عوام کی شرکت کا حق مانگنا ہے۔ معاشرے کے روایتی اداروں پر سوال کرنا اور ان لوگوں کا بیدار ہونا ضروری ہے جو معاشرے کے اندر گھاٹے والی سائڈ میں رہ رہے ہوتے ہیں۔

سماجی مسائل اور تعلیم

تعلیم کسی معاشرے میں پھیلی عدم مساوات کو دور کرنے کا ذریعہ ہوا کرتی ہے' برطانیہ میں بڑا واضح طبقاتی نظام موجود تھا' جس کا حل تعلیمی نظام سمجھا گیا' چنانچہ سولہ سال کی عمر تک کے بچے کے لیے اسکول میں حاضری لازمی قرار دے دی گئی اور تعلیم کو مفت کر دیا گیا گو طبقہ امراء کے لیے پرائیویٹ ''پبلک سکول'' بھی موجود رہے' لیکن مساویانہ تعلیمی مواقع پہنچانے کے لیے جامع (Comprehensive) اسکولوں کا اجراء کیا گیا تا کہ نصاب کا دائرہ وسیع کر کے طلباء کی استعداد

اور صلاحیتوں کو اجاگر کیا جا سکے اور انہیں فنی اور پیشہ ورانہ تربیت ایلیمنٹری اسکول سے ہی دینی شروع کی جا سکے۔ اسی طرح امریکہ میں بھی مساویانہ تعلیمی مواقع مہیا کر کے اپنے نسلی، سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کا حل ڈھونڈا گیا اور معاشرے کے پس ماندہ طبقوں کو آگے لایا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تعلیم غیر تعلیمی مسائل کو حل کرنے کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے، دیہاتی اور شہری، امیر اور غریب اور مختلف خطوں کے درمیان پایا جانے والا فرق تعلیم کے مواقع اور سہولتوں کو فراہم کر کے کم کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے ملک میں حکومتیں پس ماندہ اور نسبتاً ترقی یافتہ خطوں کے درمیان عدم توازن کو دور کرنے کے لیے کوٹا سسٹم کا نفاذ کرتی ہیں، تا کہ غیر ترقی یافتہ علاقوں کے کم اہلیت والے طلباء کو ریاستی فنڈ پر چلنے والے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخل کیا جائے تا کہ وہ بھی مقابلے کے امتحان پاس کر سکیں۔ لیکن یہ مسئلے کا ہرگز حل نہیں، بلکہ یہ ایک دوسری طرح کی ناانصافی کو جنم دیتا ہے کیونکہ یہ اہلیت (Merit) کی بنا پر استحقاق کا خاتمہ کرتی ہے اور اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حکومت علاقائی عدم توازن کو دور کرنے کی آڑ میں تعلیمی سہولتیں اور مواقع عام کرنے کے اپنے فریضے سے گریز کر رہی ہے یہ نہایت مضحکہ خیز بات ہے کہ جب میرٹ کی بجائے آپ کی جائے پیدائش معیار بن جائے۔ ''مساویانہ مواقع'' دینے کا یہ طریقہ نہ صرف ناجائز ہے بلکہ مجرمانہ بھی ہے، اس لیے کہ اس سے علاقائی عدم مساوات دور ہونے کی بجائے علاقائی نفرت کو فروغ ملتا ہے۔ لوگ اپنی محرومیوں کا الزام ایک دوسرے پر ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ جن علاقوں کا حق مارا جاتا ہے وہاں کے نوجوانوں میں مایوسی پیدا ہوتی ہے اور پس ماندہ علاقوں کی عمومی حالت میں کوئی بہتری بھی واقع نہیں ہوتی۔ علاقائی تعلیمی عدم مساوات کا ایک ہی حل ہے کہ حکومت وہاں وسیع پیمانے پر تعلیمی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے ضروری پیسہ صرف کرے۔

یہ پالیسی بھی غلط ہے کہ ایک علاقے کے تعلیمی اخراجات کم کر کے پس ماندہ علاقوں کو دے دیئے جائیں کیونکہ ریاضیاتی مساوات مشکل سے ہی انسانوں پر لاگو کی جا سکتی ہے اور نہ ہی

ایسا کرنے سے سب کو تعلیم مساویانہ طور پر مل سکتی ہے۔ کیونکہ جب ایک کسان کا بچہ ایک پروفیسر اور سیکرٹری کے بچے کے ساتھ امتحان میں بیٹھے گا تو فنی نقطہ نظر سے انہیں برابر کا موقع مل رہا ہوگا لیکن حقیقت میں برابری کوسوں دور ہوگی۔ اس کی مثال کچھ یوں ہوگی کہ ایک گھوڑے کو آپ نے ہفتوں اصطبل میں باندھ کر رکھا ہو اور دوسرے گھوڑے کی روزانہ خوب ورزش اور تربیت کی جائے اور دونوں گھوڑوں کی ریس ایک ہی پوائنٹ پر کھڑا کر کے لگا دی جائے اس طرح قانونی اور ٹیکنیکل لحاظ سے دونوں کو مساوی موقع تو ضرور دیا جا رہا ہوگا' لیکن حقیقت میں دونوں کی برابر پوزیشن ہرگز نہ ہوگی' چنانچہ بات برابری کی نہیں انصاف کی ہونی چاہیے۔ قوم کے ہر باشندے کو سماج سے اتنا ضرور ملنا چاہیے' کہ وہ خود کو معاشرے سے وابستہ محسوس کر سکے' چنانچہ مساوات کی بجائے اخوت کے جذبے کو فروغ ملنا چاہیے' تاکہ قوم کے مختلف طبقے ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

فلاسفروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ مواقع (Opportunities) اور ''حق'' (Right) کے الفاظ سے ترشح ہوتا ہے کہ کسی رعایت (Privilege) کی بات کی جا رہی ہے۔ جیسے یہ کسی اور کی ڈیوٹی ہے کہ آپ کو وہ مہیا کرے جس کے آپ مستحق ہیں' ''تعلیمی حق'' کے الفاظ کھوکھلے اور غیر واضح ہیں' یہ صرف اتنی صراحت کرتے ہیں کہ کسی کو تعلیم کی رسائی سے محروم نہ رکھا جائے۔ اس میں طالب علم کی دلچسپی اور اہلیت کا کوئی ذکر نہیں ہوتا' کیونکہ اگر سب کو رسائی دے بھی دی جائے' پھر بھی مراعات یافتہ اور بہتر پس منظر کے حامل سب سے زیادہ ''انعامات'' جیت کر لے جائیں گے۔

پرائمری اور کوالٹی کی تعلیم کا سوال

کسی بھی ملک کے لیے سب سے اہم ترین چیلنج ناخواندگی کا خاتمہ ہے اور اس ہدف کا حصول محدود مدت میں پانے کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں میں نہ صرف شعور (Awareness)

پیدا کیا جائے بلکہ ایک پر جوش تحریک چلانے کی ضرورت ہوگی۔ ہر شخص انفرادی اور اجتماعی طور پر تہیہ کر لے کہ اپنے ملک میں ناخواندگی کو برداشت نہیں کرنا۔ یہ کام نہ تو مقدس روایات دہرانے سے ہوگا نہ معروف شخصیتوں کے ٹی وی پر تلقین کرنے سے کیا پوری آبادی تک عمارتیں، فرنیچر، ٹیچر، کتابیں، اسٹیشنری اور یونیفارم کی سہولتیں پہنچائی جارہی ہیں؟ کیا حکومت وقت واقعی خواندگی کا سو فی صد ہدف کسی محدود مدت میں حاصل کرنے کے لیے کوئی سیاسی عزم (Political Will) رکھتی ہے؟ کیا اس کے لیے فنڈ اور وسائل مختص کیے گئے ہیں؟ کیا اس کے لیے عوام کے مختلف طبقوں کو متحرک کیا گیا ہے اور کیا اسے ریاست کی اعلیٰ ترین ترجیح قرار دیا ہے؟ حکومت کے سیاسی عزم اور عوام کی وسیع تر شرکت کے بغیر ناخواندگی کے ناسور کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ تعلیم کے عام کرنے کے لیے پرائیویٹ سیکٹر کو ضرور ساتھ ملایا جائے، لیکن اساتذہ فراہم کرنے کا نظام مرکزی ہونا چاہیے تاکہ غیر تربیت یافتہ تدریسی اسٹاف کی شکایات پیدا نہ ہوسکے۔ تعلیم کی نچلی سطح تک ضروری نہیں کہ نصاب سب اسکولوں کا یکساں ہوتا کہ مختلف علاقائی ضرورتوں کا لحاظ رکھا جاسکے اور جہاں تک تعلیم کے معیار کا تعلق ہے، اس بحث کو اسٹینڈرڈ آف ایجوکیشن کی بجائے کوالٹی آف ایجوکیشن میں منتقل کرنا چاہیے۔ اچھی کوالٹی کی چھری کے لیے ضروری نہیں کہ وہ سونے کی ہو، عام دھاتی چھری ہی کیوں نہ ہو اس کا سخت اور تیز ہونا ضروری ہے، جو آپ کی مرضی کے مطابق تسلی بخش طریقے سے مطلوبہ چیز کو کاٹ سکے، چنانچہ کسی چیز کی کوالٹی دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی موزونیت (Fitness) اور کارکردگی کو دیکھا جائے، جس کے لیے وہ چیز بنائی گئی ہے۔ اب اچھی کوالٹی کی ایجوکیشن ہے یا نہیں اس کا پتہ ہمیں اس کی پراڈکٹ (طلبا) سے ملے گا۔ تعلیم کی کوالٹی کو دیکھنے کے لیے ہمیں ''تعلیم یافتہ'' فرد کو دیکھنا ہوگا۔ یہ بھی سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ تعلیم کی مقدار کے اضافے سے معیار گر جائے گا، جیسے شربت میں زیادہ پانی ڈالنے سے کوالٹی گر جاتی ہے لیکن اس مثال میں شربت کی مقدار ثابت فرض کی گئی ہے جب کہ تعلیم کے زیادہ ہونے سے پانی کی نہیں، شربت کی مقدار بڑھے گی۔ البتہ آج کل پانی زیادہ ڈالنے کی مثال ضرور صادق آتی ہے

کیونکہ آبادی کے اضافے کی نسبت سے نئے تعلیمی ادارے نہیں بنائے جارہے۔موجودہ تعلیمی سہولتوں پر مزید بوجھ ڈال کر تعلیم کی بڑھتی ہوئی طلب کو پورا کیا جارہا ہے اور یوں تعلیمی اداروں کی صلاحیت کار سے زیادہ سیٹیں کرنے سے معیار گر رہا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پرانے زمانے کا تعلیمی نظام اچھا تھا۔حقیقت میں صورت حال ایسی نہیں ہوتی صرف یہ ہوتا ہے کہ آج کی بدلتی ہوئی دنیا کے لحاظ سے ہمارے تعلیمی نظام کو جتنا ترقی یافتہ ہونا چاہیے تھا اتنا آگے نہیں بڑھتا تو پھر ہمیں ماضی کا نظام اور مواد بہتر لگنے لگتا ہے۔ ہمارا نصاب معاشرے کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے مطابق خود کو ڈھالنے میں نہایت سست رفتار ہے' ساری دنیا میں کمپیوٹر نرسری سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک نصاب کا لاینفک حصہ بن چکے ہیں لیکن ہمارے ہاں کسی بھی سطح پر عام تعلیمی اداروں میں کمپیوٹر آج بھی غائب ہے۔مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے کئی سال بعد بھی طلباء اسے پاکستان کے حصے کے طور پر پڑھنے کے لیے مجبور تھے۔ جب کہ صورت حال مکمل طور پر تبدیل ہو چکی تھی۔ جب وقت سے پیچھے کی چیزیں پڑھائی جائیں گی تو طلبا کے ذہن کھلنے کی بجائے الجھ جائیں گے اور تعلیم کی کوالٹی گر جائے گی۔

❖.....❖.....❖

کیا تعلیم فارمیشن کا نام ہے؟

ارشد محمود

کبھی آپ غور کریں، ہمارے ہاں اکثر اسکولوں کی دیواروں پر یہ نعرہ بڑے جلی حروف میں لکھا ہوتا ہے Education is formation not information، پتہ نہیں یہ نعرہ کس کی ایجاد ہے لیکن اس قول کی دانش سے ہمارے اساتذہ، تعلیمی ماہرین بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ لگتا ہے، ہمارے تعلیمی فلسفے کی اساس اسی قول میں مضمر ہے.....نعرے یوں ہی مقبول نہیں ہوتے، ان سے قوموں کی اجتماعی سائیکی کا پتہ چلتا ہے۔ اس نعرے کا سیدھا سادھا ترجمہ یہ ہے کہ تعلیم معلومات حاصل کرنے کا نہیں، مخصوص قالب میں ڈھلنے کا نام ہے۔ اگر یہ نعرہ ہم نے مغرب سے مستعار لیا ہے تو ہم نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ کم از کم مغربی اقوام نے اس نعرے کو کبھی اپنی تعلیم کی بنیاد نہیں بنایا۔ سچ تو یہ ہے کہ افلاطون سے لے کر جان ڈیوی تک مفکرین نے اس نعرے کے برعکس خیالات کو فروغ دیا۔ جس کے نتیجے میں جمہوری اور انسانی اقدار پر ایمان رکھنے والا خوشحال یورپ وجود میں آیا۔

اگر مذکورہ نعرہ لے کر چلیں تو پہلی بات یہ سامنے آئے گی کہ تعلیمی منتظمین اور معلمین کا غالب دھیان تعلیم دینے میں نہیں بلکہ اس کی وساطت سے خاص قسم کے ذہن اور فکر کے حامل افراد بنانا ہو جائے گا۔ اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلیم کے بنیادی مقصد سے ہٹ جائیں گے اور تعلیم کی تخفیف ہو کر محض خواندگی رہ جائے گی۔ ہماری قوم کے پڑھے لکھے افراد میں تعلیم یافتہ ہونے والی بات نظر نہیں آتی یا وہ اپنے رویے، مزاج اور فکر میں ناخواندہ لوگوں سے مختلف نہیں ہو پاتے تو

اس پر حیران نہیں ہونا چاہیے۔انہیں صرف خواندہ ہی بنایا گیا ہوتا ہے۔جدید نظریات کے مطابق تعلیم کا مطلب ''علم دینا''نہیں فرد کو علم کے ''پراسس''میں ڈالنا ہوتا ہے۔چہ جائیکہ اس کا مطلب فارمیشن (تشکیلِ شخصیت) کیا جائے۔ جب تعلیم کو فارمیشن (Formation) کی سطح پر لے آئیں گے تو نہ صرف پوری فلاسفی تبدیل ہو جائے گی بلکہ نصاب، تعلیمی منتظمین اور اساتذہ کا سارا کردار علم پروری کی بجائے (Indoctrination) یا دوسرے لفظوں میں برین واشنگ ہو جائے گا۔ریاست کے سامنے پہلا سوال یہ ہوگا کہ کیا پڑھا جائے اور کیا نہ پڑھا جائے۔گویا علم کے پراسس کا آغاز ہونے سے پہلے ہی خاتمہ ہو جائے گا۔علم معروضی چیز کا نام ہے اور اسے آزاد فضا کی ضرورت ہوتی ہے۔سچائی کو جاننے کے لیے پہلے سے شرائط نہیں باندھی جاسکتیں۔اگر اسے مخصوص فکری سمت دیں گے تو پھر وہ علم نہیں ہوگا، عقائد کا مجموعہ ہوگا.....علم اس وقت تک وجود میں نہیں آتا جب تک وہ ٹھوس حقائق، دلائل، تنقید اور تجربے کی کسوٹی پر پورا نہ اُترے۔علم کے برعکس وہ اندھا ایمان رہ جائے گا۔جس کی بنیاد خالص جذبات پر رکھی جاتی ہے۔اور ایسے جذبات علم کا اور بھی ستیاناس کر دیتے ہیں جب تقدیس کا عنصر بھی شامل ہو جائے۔علم اندھے انصاف کی مانند ہے جو اپنے اور بیگانے کو نہیں دیکھتا۔ماضی سے ورثے میں ملے ہوئے مقولوں کا خاتمہ کرتا ہے۔صداقت آفاقی نظام سے متعلق ہوتی ہے وہ کسی مخصوص گروہ یا جغرافیے سے وابستہ نہیں ہوتی۔علم کا مطلب آیئے جانیں.....کیا ہے؟ کس طرح ہے؟ کیوں کر ہے؟ اور پھر علم کو ہنر سے اپنے فائدے اور ترقی کے لیے استعمال کرنا ہوتا ہے۔لیکن علم کے حوض میں اگر پہلے سے طے شدہ معیارات اور خود ساختہ تعصّبات کو لے کر جائیں تو علم کا شفاف پانی گدلا ہو جائے گا۔علم کی دنیا میں آپ جتنا آزادانہ گھومیں گے، آپ پر اتنی ہی زیادہ سچائیاں منکشف ہوتی چلی جائیں گی۔ لیکن اگر آپ خود کو علم اور سچائی کا ''استاد'' سمجھ کر چلیں گے تو علم آپ کے ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔علم اپنے عمل میں ایک جمہوری اور سیکولر فعل ہوتا ہے۔آمریت اور تقدیس اسے مسخ کرتی ہے۔ہمیں اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ علم اور سائنس کو انھی قوموں نے پایا ہے جو اپنی فطرت میں

جمہوری اور سیکولر ہوگئیں۔علم کے حصول کے لیے انسان کا فکری لحاظ سے آزاد ہونا ضروری ہے۔ تحصیل علم کا مطلب ہی یہ ہے کہ ابھی آپ نے جاننے کا عمل شروع کرنا ہے۔اگر آپ پہلے سے ہی جانتے ہیں تو علم کی ضرورت نہیں۔علم خود آزاد ہے۔اس پر کسی کی پابندی نہیں لہٰذا وہ ان لوگوں کو نہیں ملتا جو ذہنی طور پر غلام ہوں۔علم ذہنوں کو آزاد کرتا ہے۔ماضی کی آلودگی کو صاف کرتا ہے اور مستقبل کے امکانات دکھاتا ہے۔جامد اور پہلے سے بھرے ہوئے ذہن علم کو نہیں پا سکتے اور نہ اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔اُلٹا وہ حقائق سے خوف زدہ ہوتے ہیں وہ سچائی پر جذبات کو ترجیح دیتے ہیں۔چنانچہ ہمارا تعلیمی نصاب حقائق کی سائنس یعنی معروضیت کی بجائے جذبات سے مرتب کیا جاتا ہے۔چنانچہ تعلیمی نصاب حقائق کی سائنس یعنی معروضیت کی بجائے جذبات سے مرتب کیا جاتا ہے۔چنانچہ تعلیمی ادارے ایسے گھسے پٹے سانچے ہیں جن سے وہ افراد نکلتے ہیں جو خواندہ تو ہیں لیکن سچائیوں سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی تخلیقی صلاحیتوں سے ماحول میں تبدیلی اور ترقی لا سکتے ہیں۔

آج کے مفکرین اس بات کے بھی سخت خلاف ہیں کہ استاد خود کو ''علم دینے والا'' سمجھ لے اور وہ طالب علموں کے اوپر آقا اور ''ماسٹر'' نہ بن جائے۔تعلیم کے عمل میں برابری اور کھلے پن کا ماحول قائم کرنے کے لیے جدید تعلیمی اداروں میں استاد کو ''سر'' کہنا دور کی بات اساتذہ خود کو استاد یا ٹیچر کے لقب سے بلائے جانے کو بھی معیوب سمجھتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں کہ طالب علم انھیں نام لے کر بلائیں (اب پاکستان میں بھی جدید اور ممتاز تعلیمی اداروں میں یہ روایت چل پڑی ہے اور آمرانہ مزاج کا اُستاد جو خود کو عقلِ کل اور سماجی اقدار کا رکھوالا سمجھتا تھا فیوڈل نظام کی ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ رفتہ رفتہ مٹ رہا ہے اور اس کی جگہ جمہوری اور کشادہ ذہن کا علم اُبھر رہا ہے) انسان علم کی جس وسعت اور گہرائی میں جا چکا ہے وہاں استاد ہی کیوں نہ ہو کسی کا علم کے منبر پر چڑھ بیٹھنا بے علمی کی بات ہی ہو سکتی ہے۔

فارمیشن'' کے نظریے کی مقبولیت کی وجہ ہمارے معاشرے میں آمرانہ اور فیوڈل مزاج

کی پختگی کی دلیل ہے۔ جس میں طاقت ور کمزور کو 'ٹھیک' کرتا ہے۔ ریاست شہریوں کو، حکمران عوام کو، باپ اولاد کو، مرد عورت کو، اساتذہ طلبأ کو..... اس سے اسٹیبلشمنٹ کے مفادات کا تحفظ اور 'اسٹیٹس کو' قائم رکھنا مقصود ہے۔ ہماری ریاست اور معاشرے پر فوجی غلبے کے سیاسی و سماجی اثرات بھی اس کی ایک وجہ ہیں۔ اپنے مخصوص قومی تناظر میں یاد کرانا شاید مناسب ہوگا کہ ''فارمیشن'' کا لفظ فوج میں استعمال ہونے والی ایک عسکری اصطلاح ہے۔ یہاں تعلیم کا مقصد ہے عوام کو نام نہاد محبِ وطن اور اچھا مسلمان بنایا جائے۔ جب کہ علم، سچائی اور روشنی کا نام ہے۔ جب علم ملے گا سچائیاں خود بہ خود سامنے آ جائیں گی اور ایک ایسا انسان بننے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا جو اپنے ماحول سے محبت کرتا ہے۔ لیکن جب کوئی ادارہ، گروہ یا شخص کسی دوسرے کو کچھ خاص قسم کی ''چیز'' بنانا چاہیں تو سمجھ لیں کہ کچھ مقاصد پنہاں ہیں۔ اس کا سچائی، علم اور صداقت سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی بھی انسان علم اور آگہی سے ''خراب'' نہیں ہوسکتا۔ معاشرے میں جتنی بھی خرابی ہوتی ہے۔ وہ جہالت کی پیداوار ہوتی ہے اور جو معاشرہ جتنا زیادہ خراب ہوگا اس کا مطلب ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ جاہل ہوگا۔ آمرانہ افکار کی ضرورت بد دیانت کو ہوتی ہے۔ کوئی بھی دیانت دار معاشرہ آزادیِ فکر پر پابندی لگنا ضروری نہیں سمجھے گا۔ وہ چاہے گا کہ شہریوں کی خود ساختہ فارمیشن کرنے کی بجائے علم خود ان کی فارمیشن کرے۔ وہ حقائق کی روشنی میں اپنی فارمیشن کے عمل سے خود گزریں۔ اگر پاکستان کے عوام کو مصنوعی طور پر محبِ وطن ''بنانے'' کی کوشش نہ کی جاتی تو پاکستان کبھی نہ ٹوٹتا۔ اگر ہمارا تعلیمی نصاب اور میڈیا عوام کو اچھا مسلمان بنانے کی کوشش نہ کرتا تو پاکستان کے عوام زیادہ اچھے مسلمان ہوتے! یہ عمل اور علم کی دنیا ہے۔ مادی اور ٹھوس حقیقتوں پر مشتمل۔ اسے دیکھا، چھویا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ عمل سے علم ملتا ہے۔ مخصوص لفظوں، فقروں اور پیراگرافوں کے رٹے لگانے سے نہیں۔ خواہ ان کے ساتھ آپ کی وابستگی کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ بے نتیجہ رہیں گے۔ انسان ہو یا ماحول، بدلتا صرف علم ہے، ایک سچا علم۔ جس کو کوئی گھڑ نہیں سکتا۔ وہ کسی کی ملکیت نہیں ہوتا۔ نہ کسی کے قبضے میں۔ وہ کائنات کے اندر بالکل آزاد اور ننگ دھڑنگ

ہوتا ہے۔اس پر کوئی ملمع نہیں چڑھا ہوتا۔اس کا کوئی نام اور جغرافیہ نہیں ہوتا۔بس جاننے کی جستجو، پیاس اور ہمت چاہیے۔علم اور سچائیاں خود ہی واضح ہوکر آپ کے سامنے آجائیں گی اور پھر علم آپ کی جو بھی فارمیشن کرے۔ہمیں اس پر اکتفا کرنا چاہیے۔وہی سب سے بڑی سچائی ہے وہی سب سے بڑی اخلاقیات ہے، جسے فطرت اپنے قوانین سے بناتی ہے۔یہ ظلم کی بات ہے کہ تعلیم کو علم فراہم کرنے کا وسیلہ بنانے کی بجائے اسے طالب علم کی شخصیت اور فکر کی مخصوص قالب میں تشکیل دینے کا ذریعہ سمجھا جائے۔تعلیم کو فارمیشن کا ذریعہ سمجھنے والے دنیا میں آج تک مندرجہ ذیل تین طرح کے گروپ شامل رہتے ہیں:

- مذہبی تعلیم دینے والے
- فاشزم یا نازی ازم پر یقین رکھنے والے
- کمیونسٹ معاشرے

مندرجہ بالا تعلیمی نظام میں یہ سوچ کر تعلیم دی جاتی کہ حصولِ ''علم'' کے بعد کس طرح کے افکار ہونے چاہیے۔گویا تعلیم تلقینِ عقائد بن جاتی ہے۔اسے ایک ہی دائرے میں جامد کر دیا جاتا ہے۔جب آپ فارمیشن کا نظریہ لے کر چلتے ہیں تو آپ پہلے سے ہی کچھ اقدار اور نظریات کو متعین کر لیتے ہیں۔جن کی طرف آیندہ تعلیم کو موڑنا ہے۔یہ کچھ ایسے ہی ہے کہ سفر پر نکلنے والے شخص کے پاؤں میں رسّی باندھ دی جائے۔ظاہر ہے وہ آپ کے مطلوبہ فاصلے سے آگے نہیں جا پائے گا۔اسی کا نام فارمیشن ہے۔کیا ہونا ہے، کیا بنانا ہے، یا کیا حاصل کرنا ہے اگر اسے فلسفے کی سطح پر پہلے سے طے کر لیا جائے تو پھر تعلیم کا مقصد فوت ہو جائے گا۔تعلیم علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور علم صداقت کی جستجو کے سوا کچھ نہیں۔یہ دنیا کن عناصر سے بنی ہے۔اور کن قوانین کے تحت عمل پیرا ہے اس کی آگہی کا نام علم ہے۔کیا پتہ ہے کہ آپ علم کے حصول سے پہلے ہی جن مقاصد کا تعین کر رہے ہیں حقائق اور علم انھی کی تردید کر دیں.....لہٰذا ہمارا مقصد فقط علم (صداقت) کا حصول ہونا چاہیے۔پہلے صداقت کا تو پتہ چلے پھر صداقت خود ہماری ذات اور افکار کی تشکیل کر

دے گی۔

اگر ہمیں صداقت کا پہلے ہی پتہ ہے تو پھر تعلیم کے ادارے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اس کے جواب میں کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم کے ادارے کی اس لیے ضرورت ہے کہ پچھلی نسل کو پہلے سے معلوم صداقت کا علم منتقل کرے۔ اگر تعلیم کے یہی معنی ہیں تو یہ بہت میکانکی اور محدود نوعیت کا معاملہ ہو کر رہ جائے گا۔ زندگی اور کائنات تو حرکت سے عبارت ہے۔ یہاں جامد اصول اور ابدی قسم کی صداقتیں کام نہیں کرتیں۔ ان کے اپنے زماں و مکاں کے حساب سے تجدیدِ نو ہونی ضروری ہے۔ علم کا یہی پراسس ہے۔ صداقت تو آبشار ہے جس میں ہر دم تر و تازہ صداقتیں گرتی رہتی ہیں۔ جو صداقت باسی ہو جائے وہ صداقت ہی نہیں ہوتی۔ اگر آپ کے پاس سچ مُچ کی صداقت ہے تو زمانہ اس کا خود بہ خود ساتھ دے گا ورنہ وہ ماضی کے علمی عجائب گھر کا حصہ بن جائے گی۔ اگر ہم سچ مچ علم کے پیاسے ہیں تو پھر ہمیں صداقتوں کے سامنے آنے پر انھیں قبول کر لینا چاہیے۔ تہذیب اور سماجی ترقی کا عمل یونہی قائم رہ سکتا ہے۔ اگر ہم نے علم کا مقصد ہی فارمیشن بنائے رکھا۔ تو زوال، پسماندگی اور سقوط ہمارا مقدر ہوگا۔ ہمیں افلاطون کے اس قول کو نہیں بھولنا چاہیے ''جدھر بھی دلیل مجھے لے جائے گی میں اس طرف چلا جاؤں گا۔''

یہ ہے تعلیم کی بنیادی روح۔ مغربی اقوام نے ترقی اس اصول پر حاصل کی ہے۔ صداقتیں پہلے متعین نہیں کی جا سکتیں۔ وہ عمل اور کھوج سے ہی سامنے آتی ہیں۔ وہ انسان، انسان نہیں جو صداقت سے ڈرتا ہو۔ تعلیم کا عمل کسی نظریاتی ایجنڈے کے بغیر شروع کرنا چاہیے۔ یہی سائنسی روّیہ ہے۔ ہم علم لینے چلے ہیں، جاننے چلے ہیں۔ اب جو بھی سامنے آئے۔ اس پر ہمیں فخر کرنا چاہیے۔ اس کے مطابق خود کو ڈھالنا چاہیے۔ علم کو ''خود ساختہ'' کریں گے، اسے اپنے مطلب، مرضی، مفادات اور تعصّبات کے مطابق ڈھالیں گے تو وہ علم نہیں رہے گا اور ہمیں اس بات پر بھروسہ ہونا چاہیے کہ علم یعنی معروضی صداقت کو پا لینے کے بعد انسان پہلے سے زیادہ خوبصورت بنے گا۔

جولوگ ''فارمیشن'' کوتعلیم سمجھتے ہیں۔وہ درج ذیل شکوک میں مبتلا ہوتے ہیں۔انھیں یہ شک ہوتا ہے کہ تعلیم کے ذریعے جوعلم سامنے آنے والا ہے۔وہ اس علم سے مختلف ہوگا جسے وہ پہلے سے علم سمجھتے ہیں۔حفظ ماتقدم کے طور پر وہ تعلیم کے سارے پراسس کو ہی فارمیشن کا نام دیتے ہیں۔تاکہ پہلے سے ہی طے کرلیا جائے کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کس طرح کا آدمی بننا ہے۔

ان کا دوسرا یہ شک ہوتا ہے کہ علم کہیں طالب علم کو''خراب'' نہ کردے۔ان کا یہ خدشہ اس حد تک حاوی ہوجاتا ہے چنانچہ وہ علم کو سنسر کرتے ہیں!علم کو مسخ کر کے طالب علم تک پہنچنے دیا جاتا ہے اور یوں علم کا ہی قتل ہوجاتا ہے۔چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمارا پڑھا لکھا آدمی تعلیمی اداروں سے جب گریجویٹ ہوکر نکلتا ہے۔اس میں صاحب علم والی کوئی بات آپ کو متاثر نہیں کرتی۔اس کی سوچ بچار، کریکٹر، مزاج ویسا کا ویسا ہی ہوتا ہے جس طرح اس معاشرے کے کسی بھی ناخواندہ آدمی کا۔اس میں ڈگری لینے کے بعد کوئی قلبی وذہنی تبدیلی واقع نہیں ہو پاتی۔معاشرہ ویسا کا ویسا ایک جگہ پر کھڑا رہتا ہے۔یکسانیت اور یک رُخی سوچ کا حامل.....اس میں ترقی اور تبدیلی کے اِمکانات پیدا نہیں ہو پاتے۔پڑھا لکھا آدمی ہونے کے باوجود بھی اپنے گردوپیش کا نئی طرح سے تجزیہ کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتا ہے۔وہ نئے سوال نہیں اُٹھا سکتا۔اس کی، سماجی، اخلاقی اور کائنات کے بارے میں فکر بنیادی طور پر وہی رہتی ہے جو تعلیم اور نام نہاد علم کے حصول سے پہلے تھی۔

فارمیشن کا نظریہ تخلیقیت (Creativity) کی موت ہے۔یہ صرف کاپی بنانا سکھاتا ہے۔ہماری ذہنی اور قلبی تشکیل کا جو کام علم نے کرنا ہوتا ہے۔وہ کام ہم اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں اور پھر علم کو اپنے قومی، علاقائی اور گروہی تعصب کے مطابق ڈھالتے ہیں۔تعلیمی عمل محض رٹے کا نام رہ جاتا ہے۔وہ سوچنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہونے دیتا۔اس لیے کہ تجربہ کرنے اور نتائج خود اَخذ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔جو علم کی جستجو پیدا نہیں ہونے دیتا۔علم خود عمل پر ابھارتا ہے۔اس لیے کہ علم ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔علم کے بعد انسان فارغ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔وہ

مزید علم کا متلاشی رہے گا اور حاصل کرتا رہے گا۔ مگر افسوس کہ یہ سب چیزیں ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں ناپید ہوگئی ہیں۔ اس لیے کہ ان کی تربیت ایسے تعلیمی ماحول، اداروں اور ان کے اساتذہ کے زیرِ اثر ہوئی ہے جن کا مقصد علم دینا کم اور ان کی فارمیشن کرنا زیادہ تھا۔ جو علم کو بہتا دریا، بے کراں اور ہر دم نئے انداز سے منکشف ہونے والا مانتے ہی نہیں۔ وہ طالب علم کے ذہن کو کھلنے ہی نہیں دیتے۔ ہمارے طالب علم پر سوال، بحث اور دلیلوں میں الجھنے کی پابندی ہے کہ استاد کا ''احترام'' بہت ضروری ہے۔ وہ اخلاقیات، تقدیس اور وطنیت کے نام پر جس طرح کے بھی متعصب اور غیر سائنسی نظریات ٹھونستا ہے، کھلی چھوٹ ہوتی ہے۔ طالب علم کا کام خاموشی سے سننا، اسے قبول کرنا اور اس کا رٹا لگانا ہے تاکہ کمرہ امتحان میں اس کی قَے کی جا سکے۔ ظاہر ہے اس طرح کا تعلیمی نظام مدبر اور سائنس دان پیدا نہیں کر سکتا۔ صرف اندھوں کی قطار ہی بنائی جا سکتی ہے۔ جو ایسی بوسیدہ تہذیب اپنے کندھوں پر اُٹھائے پھریں۔ جس کے تخلیقی سوتے خشک ہو چکے ہوں۔

ہم علم سے خوف زدہ کیوں ہیں؟ ہمیں علم کی معروضی صداقت پر ایمان کیوں نہیں۔ اس پر ہمیں غور کرنے کی اَشد ضرورت ہے۔

❖.....❖.....❖

اخلاقیات اور تعلیم

ہم تعلیم سے تین طرح کی توقعات رکھتے ہیں (i) تعلیم انسان کو با اخلاق بنائے تا کہ معاشرے میں امن اور ہم آہنگی قائم رہے۔ (ii) تعلیم انسان کی فطری تخلیقی قوتوں کو جلا بخشے اور اسے ہنرمند بنائے تا کہ وہ اپنے اور اپنے خاندان کا معاشی کفیل بن سکے۔ (iii) تعلیم اسے اس قابل بنائے کہ وہ معاشرے کی تعلیم و ترقی اور اسے آگے لے جانے میں اپنا فعال کردار ادا کر سکے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم انسان کو با اخلاق کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟ اس لیے نہیں کہ اس سے اس کا اپنا فائدہ ہوگا بلکہ دوسرے کے با اخلاق ہونے میں ہمارا اپنا فائدہ مضمر ہوتا ہے۔ اسی لیے ہم خود با اخلاق ہونے کی بجائے دوسروں کو اخلاق کا پابند دیکھنا چاہتے ہیں۔ انسان فطری طور پر وہی کام کرتا ہے جس میں اس کا فائدہ ہو۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ نیکی، صفت اور خوبی کا نام ہے کیونکہ نیکی ہماری خواہشوں پر پابندی کا مطالبہ کرتی ہے اور کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ نیکی بذات خود ہی انعام (Reward) ہوتی ہے، جرم اور غیر اخلاقیات کو اس لیے برا نہیں سمجھا جاتا کہ یہ نقصان پہنچانے والی ہیں بلکہ اس کے برعکس وہ نہایت پرکشش اور صلہ بخش چیزیں ہیں۔ اگر میری خواہش ہے کہ کوئی چوری نہ کرے تو اس میں اس کا نہیں میرا اپنا فائدہ ہے کہ میرا مال چوری سے محفوظ رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر اخلاقی حرکتوں کو لائقِ سزا سمجھا جاتا ہے اور میڈیا کے ذرائع پر پابندی لگائی جاتی ہے کہ وہ جرم کو فائدہ مند نہ دکھائیں، اس بناء پر سمجھا جاتا ہے کہ اخلاقی تعلیم کو فرد کی اپنی

بصیرت پر نہیں چھوڑا جا سکتا بلکہ سوسائٹی کا فرض ہے کہ وہ اس کا بندوبست کرے۔ پہلے یہ کام خاندان اور مذہب کا ادارہ کیا کرتا تھا لیکن جب مذہب کے معاملے میں رواداری کا مطالبہ ہونے لگا تو اخلاقیات کے بارے میں سمجھا جانے لگا کہ اس کا تعلق زندگی کے عملی معاملات سے ہے نہ کہ ریاست یا ماورائے فطرت عقائد سے۔ اخلاقیات کے اصول نہ تو غیر متبدل ہوتے ہیں نہ یہ آسمانوں سے اترتے ہیں۔ چنانچہ سائنسی اور اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ معاشروں میں بہت سے اخلاقی معاملات میں فرد کی خودمختاری کو تسلیم کر لیا گیا۔ البتہ کنٹریکٹ اور پراپرٹی کے تقدس کی حفاظت ریاست کی ذمہ داری بن گئی۔

اخلاقی تعلیم سے کچھ اس طرح کے معنی ابھرتے ہیں جیسے بذریعہ تبلیغ دوسروں کو راسخ العقیدہ کرنا ہو۔ ظاہر ہے جدید ذہن اس طرح کے طریقہ کار کو پسند نہیں کر سکتا۔ چنانچہ سوچا گیا کہ مذہب اور والدین کی اتھارٹی کمزور پڑ جانے پر اخلاقی احساس و یقین میں جو خلا پیدا ہو گیا' اسے اس طرح نہ پڑھایا جائے کہ کسی تبلیغ کا احساس پیدا ہو' بلکہ ساری انسانیت کی مشترکہ اخلاقیات مثلاً ظلم اور بددیانتی کے بارے میں اس طرح پڑھایا جائے کہ طالب علموں کا یہ حق محفوظ رہے کہ وہ اخلاقی معاملات پر اپنی آزادانہ رائے بھی تشکیل دے سکیں۔ ایک تعلیمی فلاسفر PINCOFF کا کہنا تھا کہ صرف انہی اخلاقی مسائل (Issues) کو پڑھایا جائے جو غیر مباحثہ طلب ہوں لیکن اس پر یہ اعتراض ہوا کہ اگر ایک مسئلے پر کوئی شخص اختلاف نہیں کرتا تو اسے اس بنا پر غیر مباحثہ طلب (Undebatable) کیسے کہا جا سکتا ہے چنانچہ ہمیں نوجوانوں کو اخلاقیات کی بجائے اخلاقی معاملات پر غور و فکر کرنے کا ہنر (Skill) سیکھانا چاہیے۔

مروجہ معنوں میں صاحب اخلاق کا مطلب ہے' ''قبول اور عمل کرنا جسے کوئی گروپ اخلاقیات سمجھتا ہو' چنانچہ اخلاقی معیاروں پر زماں اور مکاں ہمیشہ اثر انداز رہے ہیں۔ جب اخلاقیات اور ذاتی مفاد ایک دوسرے سے متصادم ہو جائیں گی تو ذاتی مفاد پر دوسروں کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہیے خواہ آپ کا فطری رجحان ایسا کرنے کا نہ ہو۔ اخلاقی تعلیم کا مقصد دوسروں کے

لیے خیر خواہی کے جذبات اور احترام کے جذبات کو پیدا کرنا ہے لیکن کیا ان سیاسی' اخلاقی اور مذہبی عقائد کو نظریۂ پرستانہ (Indoctrination) طریقے سے پیدا کرنا چاہیے۔ ہمیں نظریہ پرستی (Indotrination) اور تعلیم دینے (Education) کے درمیان فرق کو سمجھنا چاہیے۔ کیا عقیدہ پست اور نظریہ پرست لوگوں کو سلیم العقل اور معاملہ فہم سمجھا جا سکتا ہے۔ نظریہ پرستی اس وقت شروع ہو جاتی ہے جب ہم اخلاقی معاملات پر بچوں کی آزادانہ سوچنے کی صلاحیت کی نشو ونما کو روکنے اور ہر وقت ان پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسا کر کے ہم سمجھتے ہیں کہ شاید وہ اپنے لیے بہتر زندگی گزارنے کا طریقہ وہ منتخب کریں جو اس سے مختلف ہو جو ہم سکھا رہے ہیں۔ تعلیم کا منشا و مقصود طالب علم کو خود سے سوچنے کی تربیت دینا ہوتا ہے چنانچہ اخلاقی تعلیم کا انداز بھی یہ ہونا چاہیے کہ اس کے ساتھ اخلاقی سوالوں پر بحث کی جائے' جس میں کسی طرح کا سوال اٹھانے یا کسی موضوع کو چھیڑنے پر پابندی نہ ہو۔ طالب علم کو دوبارہ سوال کرنے اور مختلف جواب دینے کے لیے تیار ہونا چاہیے جسے وہ آج تک سنتا رہا ہے۔ کوئی اصول' نظریہ یا عقیدہ ہو اگر اس پر سوال نہیں اٹھایا جائے تو اس اصول' نظریے یا عقیدے کی پختگی اور Validity کا پتہ کیسے چلے گا۔

اخلاقیات کے سوال پر ہمارا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک جیسی صورت حال میں دوسروں کے لیے وہی تجویز کریں جو ہمیں اپنے لیے مرغوب ہو۔ طلباء کو اس انداز سے اخلاقی تعلیم دی جائے کہ بعد کی زندگی میں وہ پڑھائے گئے اصولوں سے مختلف اصول اپنانے میں آزاد ہوں بشرطیکہ نئے اصول دوسرے افراد پر بھی لاگو ہو سکیں۔ اخلاقیات کا استاد معلم (Educator) ہوگا چنانچہ اگر طالب علم اس کے ساتھ اختلاف کرے گا تو وہ نظریہ پرست (Inductrinator) استاد کے برعکس خوش ہوگا۔ نظریہ پرست اپنے اصولوں اور عقائد کو زبانی یاد کرنے پر زور دیتے ہیں' جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ لوگ عقائد کے معاملے میں ڈھیلے پڑ گئے ہیں تو نظریہ پرست ان کی قوت یادداشت پھر تازہ کرنے کے لیے ان عقائد کی زبانی دہرائی یا رٹائی شروع کر دیتے

ہیں۔ گویا ان اصولوں، ضوابط، عقائد کا تعلق زندگی کے نامیاتی عمل کے ساتھ کوئی نہیں ہوتا بلکہ یادداشت کمزور پڑنے کی وجہ سے لوگ اخلاقی ضوابط اور نظریات پر عمل پیرا نہیں رہتے۔ چنانچہ نظریہ پرست استاد طالب علم کو ایک اچھا اور دیرپا یادداشت رکھنے والا ''طوطا'' بنانے کی کوشش کرتا ہے اس سے یا تو متعصب اور جنونی (Fanatics) طلباء کی کھیپ تیار ہوتی ہے جو ساری زندگی میکانکی طریقے سے رٹے ہوئے نظریات دہراتے رہتے ہیں یا پھر وہ اکثریت بنتی ہے جو عملی زندگی میں ان اصولوں کے ناقابل عمل ہونے کی بناء پر انھیں نظرانداز کر دیتے ہیں اور دہرے معیاروں پر زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

تعلیم کب نظریہ پرستی بنتی ہے جب وہ برین واشنگ کی جگہ لے لیتی ہے جس میں ایک شخص کے لیے نفسیاتی طور پر ناممکن بنا دیا جاتا ہے کہ وہ مخصوص معاملات کے پیچھے کارفرما مقاصد پر غور وفکر کر سکے۔ برین واشنگ کے لیے شخص کے دل و دماغ میں یہ عقیدہ سرایت کر دیا جاتا ہے کہ کوئی ایک اتھارٹی (مذہبی پیشوا یا بادشاہ وغیرہ) ہوتی ہے، جو خطا سے پاک، غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے، کے بارے میں بتا سکتی ہے اور اس کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا جاتا۔ طالب علم کو تعلیم دینے کے بہانے کی ان مسائل (سیاسی اور مذہبی) کے بارے نظریہ پرست بنا دیا جاتا ہے، جن کے بارے میں اس نے نہ غور کیا ہوتا ہے نہ اسے انتخاب کی آزادی ہوتی ہے۔ طالبعلم بے چارے کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ اس کی برین واشنگ کی جا رہی ہے۔ فوج میں بھی یہی تکنیک استعمال کی جاتی ہے۔ نئے رنگروٹ کو معلوم ہوئے بغیر مخصوص سیاسی نظریات اس کے رگ وپے میں سرایت کر دیے جاتے ہیں اور اس میں یہ عقیدہ ڈال دیا جاتا ہے کہ اپنے سے اوپر والے کے حکم پر سوال اٹھانا نامناسب، ناجائز اور غیر قانونی ہے۔ نظریہ اور عقیدہ ایک ایسی چیز ہوتا ہے جسے آزادانہ منتخب نہیں کیا ہوتا، چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کا آزادانہ سوچنے کا حق یا تو سلب ہو جاتا ہے یا یہ حق دوسروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

کیا اخلاقی، سیاسی اور قومی نظریات کو ضرب کے پہاڑوں (Multiplication

(Table کی طرح یاد کروانا چاہیے؟ اور اگر یہ یقین کر بھی لیا جائے کہ ہمارے اخلاقی اور سیاسی نظریات دو دونی چار کی طرح بالکل صحیح ہیں، پھر بھی ہمیں یہ حق کیسے مل جاتا ہے کہ ہم اس کے سوچے سمجھے بغیر بچے کے ذہن میں جو چاہیں انڈیلتے رہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ نظریہ پرست لوگ اپنے کو بڑے عقل والے اپنے عقائد کو نہایت برمحل اور سچا سمجھتے ہیں، چنانچہ ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ بچہ خود نہ سوچ سکے یا اس کے سوچنے کے لیے کچھ نہ چھوڑا جائے۔ حالانکہ یہ عین ممکن ہے کہ بچہ جب بڑا ہو تو وہ معاشرتی، سیاسی، قومی اور عالمی حالات باقی نہ رہیں جو اساتذہ اور والدین کی زندگیوں میں تھے اور وہ نظریات اور اخلاقی اصول اپنی وقعت ہی کھو چکے ہوں۔ چنانچہ لازم ہے کہ بچے کی فکری تربیت اس طرح کی جائے کہ وہ حالات کے مطابق خود کو ڈھال سکے۔ نظریہ پرستی حالات کے مطابق ڈھالنے (Adaptation) کی صلاحیت کو کچل دیتی ہے اور Adaptation ہی وہ صلاحیت ہے جو علم حیاتیات (Biology) کے مطابق حیات کی تمام صورتوں کی بقاء کا راز ہے۔ نظریہ پرستی بچے کے اس حق اور صلاحیت کو روکتی ہے کہ وہ بدلتی دنیا کے بارے میں اپنے خیالات کو ہم آہنگ کر سکے جس میں اسے زندہ رہنا ہے۔ کوئی قوم یا فرد بدلتے حالات کے مطابق اپنے نظریات، عقائد اور اصولوں کو نہیں بدلتی تو بحران اور ذہنی و اقتصادی پس ماندگی ان کا مقدر بن جاتے ہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ سچائی پیش بینی (Prediction) سے کہیں زیادہ اجنبی ہوتی ہے۔ یہ بذات خود گناہ ہوگا اگر میں اپنے بچے کو اس طرح پڑھاؤں اور سکھاؤں کہ جب وہ بڑا ہو تو خود سے کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہ ہو بلکہ وہ خود کو ان عقائد کی زنجیروں میں بندھا محسوس کرے جو میں نے اسے دی تھیں یا پھر وہ خود کو میری آسیب زدہ اور نامناسب نصیحتوں میں گھرا ہوا غیر متحرک محسوس کرے۔ ہمیں بچوں اور نوجوانوں کو سوچنے سمجھنے کے طریقہ کار سکھانے ہیں، انھیں اس طرح نہیں پڑھانا کہ وہ ان اصولوں کو ہمیشہ لکیر کے فقیر کی طرح استعمال کریں بلکہ انھیں بتانا چاہیے کہ جب وقت آئے تو وہ خود اپنے اصول بھی وضع کر سکتے ہیں۔ اس کی فکر (Thinking)

میں منطق، حقائق، تصور سازی اور اپنا میلان ہونا چاہیے۔ کوئی بھی معاملہ ہو طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ نئے مسائل کا سامنا کرنے کے قابل ہو۔ کیونکہ اگر وہ ان مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل نہ کر سکا تو ان کے ساتھ متصادم ہونا پڑے گا۔ مطابقت پذیری (Adaptation) کا مطلب ہی نئے مسائل کو حل کرنے کے بارے میں سیکھنا ہے ماضی کے مردے ہاتھ سے جھٹکنا ضروری ہے۔ طالب علم کو لازماً با اخلاق اور محبّ وطن ہونا چاہیے لیکن کیسے؟.....اس پر اختلاف ہو سکتا ہے۔

کیا ''اصول'' غیر متغیر ہوتے ہیں، کیا سیاق وسباق کو دیکھے بغیر خود ساختہ ''اصولوں'' کے ساتھ چمٹا رہنا چاہیے، کیا ''اصولوں پر سودا نہیں ہوسکتا'' ہے کا نعرہ مارنے والے سچ مچ اعلیٰ کردار کے مالک ہوتے ہیں، یا ان ''اصولوں'' کے ساتھ ان کے کچھ مفادات وابستہ ہوتے ہیں؟ ایک شخص کو کیوں ضرورت پڑتی ہے کہ وہ ایسے اصولوں کو تبدیل کرے دراصل یہاں پر بقاء کا اصول 'مطابقت پذیری کا حق' (Right of Adaptation) عمل پیرا ہوتا ہے۔ جن حالات میں آپ زندہ ہیں اپنے اصولوں کو ان کے مطابق ڈھالنا ہوگا.....صرف اس طرح اپنے بہتر مستقبل کی ضمانت مل سکتی ہے۔ سچائی کا بھید پانے کے لیے ضروری ہے کہ عقیدہ خود کو چیلنج کے لیے اور اصول اپنے کو دلیل (Arguments) کے لیے کھلا رکھے۔ لہٰذا طالب علم کو اپنے استاد کے ساتھ متفق نہ ہونے کا حق ہونا چاہیے، ہمیں آنے والی نسلوں کے اخلاقی کردار کی پریشانی لاحق رہتی ہے اور ہم ان کے کردار ابتداء سے ہی تشکیل دینے کے متمنی ہوتے ہیں۔ استاد کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ طلباء میں کچھ خصلتوں کو پیدا کرے اور کچھ کی حوصلہ شکنی کر دے لیکن ایسا براہ راست کرنے کی بجائے اسے طالب علم میں خرد افروزی (Reasoning) کو فروغ دینا چاہیے تا کہ وہ صحیح ردعمل اور صحیح جبلتوں کا استعمال کر سکے۔ ہمیں کردار سازی کے چکر میں اس کی خود سے سوچنے کی صلاحیت کو نہیں دبا دینا چاہیے۔ دہشت گردی اور نظریہ پرستی ہم پلہ ہوتے ہیں دونوں کا مقصد بزدل بنانا اور خوف زدہ کرنا ہوتا ہے۔ ایک ہی طرح کے اصولوں، قاعدوں اور نظریات پر سختی سے

اندھا ایمان رکھنے والا شخص نئی طرح کی سوچ سے خوف زدہ رہتا ہے دراصل اسے ہٹ کر یا دوسری طرح سوچنے سے خوف زدہ کر دیا ہوتا ہے اور اس کی خود اعتمادی کا قتل ہو چکا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ عقیدہ پرستی دہشت گردی کی راہ اختیار کرتی ہے۔

تعلیم میں بلاشبہ اخلاقی اجزاء شامل ہونے چاہئیں جن کا مطلب اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کی فلاح و بہبود کو ترجیح دینے کے جذبے کو پیدا کرنا ہوتا ہے نہ کہ متعصب نظریات کو ٹھونسنا اور ایسی صلاحیت پیدا کرنا ہوتی ہے کہ ہر ایک خود اپنا تعلیمی اور اخلاقی فلاسفر بن سکے۔ ارسطو کا کہنا تھا کہ اخلاق اور نیکی عملی عادت سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ تبلیغ اور اخلاقیات کے لیکچروں سے۔

❖.....❖.....❖

تعلیمی مفکرین اور ہماری تعلیم

سقراط اور مثالی استاد

سقراط بھی ایتھنز کا رہنے والا تھا۔ وہ بذات خود ایک استاد تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے پچاس سال پڑھانے میں صرف کیے اور اپنا ایک پرائیویٹ اسکول قائم کیا جس میں عملی طریقہ تعلیم (Practically Oriented Education) کو رائج کیا۔

سقراط کا کہنا تھا کہ استاد کو بھرپور طریقے سے پڑھا لکھا اور تہذیب یافتہ (Thoroughly Educated) ہونا چاہیے۔ اگر ہم مذکورہ شرائط کے حوالے سے اپنے تعلیمی اداروں پر نظر دوڑائیں تو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا بلکہ ایسا لگتا ہے کہ سقراط نے یہ شرائط ہمارے تعلیمی اداروں کے اساتذہ کو دیکھ کر ہی لگائی ہیں۔ استاد کے لیے وسیع بنیاد پر پڑھے لکھے کی شرط کو لیجیے۔

.....بہت ممکن ہے ہمارے اساتذہ جو مضمون پڑھا رہے ہوں اس کی بنیادی مطلوب پیشہ ورانہ کوالیفکیشن کو بھی نہ پورا کرتے ہوں۔

.....اکثریت اپنے مضمون کے بارے میں وسیع تر مطالعہ اور اس کے جدید ترین پہلوؤں کے علم سے عاری ہوگی۔ انھوں نے اپنے مضمون کے بارے میں ''گائیڈوں'' سے سکے بند قسم کے نوٹس تیار کیے ہوتے ہیں یا انھیں اپنے کسی گذشتہ یا حالیہ ٹیچر ساتھی سے مستعار لیا ہوتا ہے یعنی انھوں

نے ٹیکسٹ بک کو بھی کبھی پورا نہیں پڑھا ہوتا۔ گویا ایک روٹین فارمولہ کاروائی ہوتی ہے جو نئی کلاس کے ساتھ بھی پچھلے سال کی طرح دہرادی جاتی ہے۔

.....''بھرپور اور مکمل طریقے سے پڑھے لکھے'' سے پتہ چلتا ہے کہ استاد کو اپنے مضمون کے علاوہ زندگی اور کائنات کے بارے میں عمومی علم سے آگاہی حاصل ہو۔ اسے سائیکالوجی اور سوشیالوجی آف ایجوکیشن سے واقفیت ہو۔ گویا نہ صرف وہ خود پڑھنے لکھنے کے کلچر سے وابستہ ہو بلکہ طلباء کو بھی وسیع المطالعہ بننے کی راہنمائی کرے۔ جب کہ معاملہ اس کے قطعی برعکس ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ ہمارے ہاں بچوں کو اسکول کی لائبریری استعمال کرنے کی بھی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے لائبریری جانے' کتابیں لینے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں اگر پیریڈ خالی ہے اور کسی بچے کی خواہش ہے کہ وہ کلاس میں شور اشرابے سے بچے اور اپنے وقت کے مفید استعمال کی خاطر لائبریری چلا جائے تو اسے منع کر دیا جاتا ہے اور کلاس میں بے کار بیٹھنے پر مجبور کیا جاتا ہے ایک آپ بیتا واقعہ مطالعہ کے شوق اور عادت کے بارے میں ہمارے اساتذہ کے معاندانہ رویے پر روشنی ڈالتا ہے ایک بار میں اسکول میں اپنے بچے کی فیس جمع کروانے گیا۔ سامنے میرے بچے کے فزکس کے استاد نظر آ گئے۔ علیک سلیک کے بعد میں نے اپنے بچے کے بارے میں استفسار کیا تو بڑے شکایتی انداز میں کہنے لگے ''جی مجھے نہیں لگتا کہ آپ کا بچہ آنے والے ٹرم امتحان میں اپنے گذشتہ ریکارڈ کی کی طرح کوئی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہر کر سکے گا'' میں نے گھبرا کر پوچھا'' کیوں کیا بات ہے' بچے کو کیا ہوا ہے' اس نے کیا کیا ہے؟'' فرمانے لگے'' آپ کے بچے نے ادھر ادھر سے لے کر سائنس کی کتابیں پڑھنی شروع کر دی ہیں۔ وہ کہیں شہر کی لائبریری سے کتابیں لے لیتا ہے' دیکھیں نا ہمارے تعلیمی نظام میں ایسے تو نہیں چلتا.....ٹیکسٹ کی کتاب کے علاوہ دوسری کتابیں پڑھنا.....نقصان دہ ہے'' ٹیچر کی بات سن کر میں سوچ کے ایک گہرے سمندر میں ڈوب گیا۔ اپنے مدرسے کا سارا تعلیمی نظام آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ استاد کا احترام بھی ملحوظ تھا اور اس کی انا کو ٹھیس بھی نہیں پہنچانا چاہتا تھا بس اتنا کہہ کر واپس چلا گیا کہ ''اچھا میں بچے سے بات کروں گا''

ذہن ڈسٹرب تو بہت ہوا لیکن سمجھ نہ آئی کہ بچے کو استاد کی شکایت کے بارے میں کیسے بتاؤں کہ وہ اپنے ہی مضمون (فزکس) کے متعلق دیگر سائنسی کتب کیوں پڑھتا ہے؟ کیا یہ بھی جرم ہے؟ .....دنیا کے کسی اسکول میں شاید ہی کسی بچے پر ایسی چارج شیٹ بنی ہو۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اس چارج شیٹ پر فخر کروں یا اپنے معاشرے کے نظام تعلیم پر ماتم۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ بچہ دراصل اپنے وسیع المطالعہ ہونے کی وجہ سے استاد سے پیریڈ کے دوران اپنے ہی سبق سے متعلقہ ایسا سوال کر بیٹھا تھا .....جو شاید استاد کی استعداد علم سے زیادہ تھا..... چنانچہ ان کے لیے نہایت ضروری تھا.....اس ''بغاوت'' کا سر کچلنا.....کہیں ایسا نہ ہو کہ دیگر بچوں میں بھی مطالعے کا شوق پیدا ہو جائے..... چنانچہ بچے کے سوال کے جواب میں نہایت غصے سے برسے۔ ''میں میں تمہیں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم بگڑتے جا رہے ہو!'' یہ اس بچے کے بارے میں کہا جا رہا تھا جو اسکول کا شریف ترین، ذہین ترین اور اعلیٰ ترین اکیڈمک ریکارڈ کا حامل تھا.....

ہمارے اسکولوں کے ''تھارولی تعلیم یافتہ'' اساتذہ کس طرح کے ہوتے ہیں۔ اس کی ایک اور دلچسپ یا شاید المناک مثال ملاحظہ ہو.....میٹرک کا ایک طالب علم رپورٹ کرتا ہے کہ سائنس کا ٹیچر توانائی (انرجی) کے سبق کو پڑھاتے ہوئے کہنے لگا ''آئن سٹائن کو اس بات کا پتہ ہماری آسمانی کتاب (نام لیتے ہوئے) سے اس وقت معلوم ہوا کہ مادہ (Mass) توانائی (Energy) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جب اس نے (ہماری مقدس کتاب میں) جنوں کے بارے میں پڑھا.....اور جنوں کے علم کو جان کر ہی آئن سٹائن نے اپنی شہرہ آفاق ریاضیاتی مساوات ''$E=Mc_2$'' تشکیل دی تھی۔ یہ ہے سائنس پڑھانے کا ''صحیح طریقہ''۔

ہمارے اساتذہ کتنے ''تعلیم یافتہ'' ہیں اس کا ذکر تو ہو گیا۔ وہ ''ہوش مند'' کس حد تک ہوتے ہیں۔ اس واقعہ سے ظاہر ہے۔ ایک بار میں اپنے بچے کے ہمراہ گرمیوں کی تعطیلات سے قبل ہونے والے پہلے ٹرم امتحان کے نتائج وصول کرنے کے لیے اسکول گیا۔ اسکول نے اس موقع پر اساتذہ/ والدین کے درمیان ملاقاتی تقریب کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ ایک کمرے

میں مختلف جماعتوں کے اساتذہ والدین کو بچوں کے پرچے دکھا رہے تھے۔ میرے بچے نے ایک لیڈی ٹیچر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ ہیں میری بیالوجی کی ٹیچر'' ان کے پاس چلتے ہیں۔ میں نے اس ٹیچر کے پاس جا کر سلام عرض کیا اور سامنے کھڑے اپنے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ آپ کا طالب علم ہے اس کا پرچہ دکھایئے۔ ٹیچر میرے بچے کو دیکھ کر کہنے لگی' یہ تو میرا اسٹوڈنٹ ہی نہیں ہے'' اب عجیب پریشان کن (Embarrasing Situation) حالت بن گئی..... بچہ بار بار کہے جا رہا ہے۔ ''ٹیچر میں آپ کی ہی کلاس میں پڑھتا ہوں۔ آپ مجھے پڑھاتی ہیں'' اور ٹیچر صاحبہ بار بار تردید کیے جا رہی ہیں.....! کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کی کیا جائے.....ٹیچر ماننے کو تیار ہی نہ تھی۔ بڑی مشکل سے اسے راضی کیا کہ وہ اپنے پاس پرچوں کو چیک کرے کہ اس بچہ کا پرچہ ان کے پاس ہے یا نہیں؟ بچے کا پرچہ انہی کے پاس سے نکل آیا.....(پتہ نہیں شرمندہ ہوکر) وضاحت کرنے لگی دراصل کلاسوں کو شروع ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا ہے۔ ابھی مجھے سارے بچوں کی شناخت نہیں ہوئی.....لیکن کامن سنس کہتی ہے کہ اگر بچوں کی شناخت نہیں ہوئی تھی تو پھر اتنے زوردار طریقے سے بہ تکرار تردید کرنے کی کیا تُک تھی.....ایسی غیر حاضر دماغی اور بدحواسی.....میں نئی نسل کی تعلیم وتربیت کا حشر کیا ہوسکتا ہے۔

سقراط نے ٹیچر کے لیے دوسری شرط یہ لگائی کہ اسے باتہذیب (Cultured) ہونا چاہیے۔ ہمارے اسکولوں کے اساتذہ کی شخصیت کے تمام ظاہری لوازمات ایک باوقار' صاف ستھری' خوشگوار اور دلنشیں (Impressive) منظر پیش کر رہے ہونے چاہیں۔ اگر ہم منافقت سے کام نہ لیں اور پینٹ شرٹ' سوٹ ٹائی وغیرہ کو غیر اسلامی لباس قرار نہ دے دیں تو مرد ٹیچروں پر اسکول کے اندر کسی اور طرح کے لباس پر پابندی ہونی چاہیے ورنہ ''ماجے گامے'' اور ایک کلچرڈ استاد میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اسکول ایک فارمل جگہ ہے' معاشرے کا اعلیٰ ترین علمی اور ثقافتی مقام ہے اس میں غیر فارمل لمبے چوڑے' ڈھیلے ڈھالے قدیم زمیندارانہ غیر صنعتی ماحول کے لباس کو قومی جذبے اور حب الوطنی کے نام پر پہننا.....آج کے ترقی یافتہ صنعتی دور کے ساتھ زیادتی

ہے۔آج کام کی کوئی بھی جگہ ہو۔سمارٹ لباس اس کا متقاضی ہے جس طرح روزمرہ استعمال ہونے والی چھوٹی بڑی مشینیں ''مغربی'' نہیں رہیں' اسی طرح نام نہاد مغربی لباس بھی ''مغربی'' نہیں۔آج کے ترقی یافتہ دور کے ساتھ مطابقت رکھنے والا یونیورسل لباس ہے' قومی جذبے اور حب الوطنی کو تعلیم میں کوالٹی اور اپنے اندر اعلیٰ کردار پیدا کر کے دیکھا جائے۔شلوار قمیض کے نام پر ''چولے'' پہن کر ''حب الوطنی'' کا مظاہرہ محض خود فریبی ہے اس کا مقصد تعلیمی اداروں کے ماحول کو تباہ کرنا تھا۔ پرانا زمانہ سست رو تھا۔لہٰذا اس وقت کے لباس بھی سست رو مزاج کے غماز ہیں۔ آج کی دنیا تیز رفتار اور چستی کی متقاضی ہے۔پرانے زمانے کے تہذیبی اور ثقافتی Antiques ہر جگہ اٹھائے پھرے نہیں جا سکتے۔

❖.....❖.....❖

افلاطون(PLATO)

تعلیم پر افلاطون کے خیالات کا ذکر کرنے سے پہلے آیئے دیکھتے ہیں کہ یونان میں اس وقت کس طرح کا نظام تعلیم رائج تھا۔ یونان بہت سی چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں پر منقسم تھا جس میں اسپارٹا اور ایتھنز سب سے زیادہ مشہور ریاستیں تھیں۔ دونوں کی بقاء کا انحصار غلاموں کی مزدوری(Slave Labour) پر تھا اگر چہ دونوں کے یونانی آباؤاجداد ایک ہی تھے مگر یہ دونوں شہر ایک دوسرے کے بہت بڑے حریف تھے۔ یونانی زبان نہ جاننے والے لوگوں کو غیر مہذب سمجھا جاتا تھا۔ اسپارٹا کی نشوونما ایک عسکری ریاست کے طور پر ہوئی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اسپارٹن کی نہایت چھوٹی سی اقلیت غیر یونانی اور مخلوط اسپارٹن نسل کی ایک بڑی اکثریتی آبادی پر حکمران تھی۔ غلام اکثریت کا کام فوجی طاقت کے لیے سخت فوجی نگرانی میں ضروریات زندگی مہیا کرنا تھا۔ گویا اسپارٹا ایک مستقل ملٹری کیمپ کی حیثیت رکھتا تھا۔ فوج کو خوف تھا کہ کہیں اپنی ریاست کے اجنبی عوام ان پر غالب نہ آجائیں لہٰذا انھوں نے ساری سماجی، ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں کو ریاست کی اعلیٰ فوجی قوت اور اس کی لڑائی کی استعداد کو برقرار رکھنے میں لگا رکھا تھا۔ اسپارٹا کی کہانی اور ہمارے ملک کے حالات میں کئی طرح کی مماثلت ملتی ہیں جس پر ہمیشہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ عسکری قوت کا غلبہ اور قبضہ رہا ہے۔ اسپارٹا کے عوام کو بھی مستقل مارشل لاء کے تحت چلایا جارہا تھا۔ تعلیمی نظام ریاست کے کنٹرول میں تھا اور اس کا مقصد تھا ''محبّ وطن'' مطیع اور فوجی خدمات سرانجام دینے کے قابل شہری پیدا کرنا تھا۔ سب بچے ریاست کے لیے وقف سمجھے جاتے

تھے اور سات سال کی عمر میں ان کی پرورش بیرکوں میں شروع ہوجاتی تھی۔ مرد وزن کو ایک ہی طرح کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جسمانی تیاری (Fitness) پر زور دیا جاتا تھا۔ جمناسٹک کرائی جاتی تھی۔ نصاب میں ادبی اور ثقافتی مواد مکمل طور پر غائب تھا۔ میوزک اور ڈرامہ فوجی رنگ اور کرداروں میں رچے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے اسے ایک عام نصاب تعلیم کم ہی کہا جاسکتا ہے البتہ اس میں کچھ مثبت نکات بھی تھے جس میں سب کو مساوی تعلیم اور تعلیم پر ریاستی خرچ اور انتظام وغیرہ شامل ہیں۔

اس کے برعکس ایتھنز ایک جمہوری شہری ریاست تھی۔ ہر شخص کو ووٹ کا حق تھا۔ ارباب اختیار چنے جاتے تھے۔ سب شہریوں کو ایک جنرل اسمبلی میں بحث مباحثے اور فیصلہ سازی میں شریک ہونے کا حق تھا۔ ایتھنز کی آبادی چند ہزار پر مشتمل تھی۔ اتنی چھوٹی سی آبادی میں ہر کوئی ''اسمبلی'' میں بیٹھ سکتا تھا اور مسئلے کو بحث کے لیے پیش کرسکتا تھا اور قانون سازی ہوسکتی تھی۔ لیکن حیرانگی کی بات یہ تھی اور جس پر افلاطون کو بھی نہایت صدمہ تھا کہ عوام کی تعلیم کے لیے کوئی خاطر خواہ بندوبست نہیں تھا کہ عوام اسمبلی میں جہالت کی بجائے ذہانت اور علم کو لے کر جائیں۔ ہر کوئی اسکول کھول سکتا تھا۔ کوئی ریاستی ضوابط اور کنٹرول موجود نہ تھے کہ ان اسکولوں میں کیا ہورہا ہے لیکن اسکولوں کا نصاب اسپارٹا والوں کے مقابلے میں متناسب تھا۔ اس میں ادب' آرٹ' میوزک' تیراکی' لکھنا پڑھنا وغیرہ شامل تھے۔ یہی وہ کثیر الجہت تعلیم تھی جس میں افلاطون اور ارسطو جیسے عظیم فلاسفر پیدا ہوئے۔

افلاطون ایتھنز کا رہنے والا اور سقراط کا شاگرد تھا۔ تعلیم کے معاملے میں ایتھنز والوں کی لاپروائی اور بے فکری پر افلاطون سخت پریشان تھا۔ خاص طور پر حکمرانوں کے لیے کسی خصوصی تعلیم و تربیت کی عدم موجودگی اس کے لیے تکلیف کا باعث تھی وہ سمجھتا تھا کہ ریاست کا انتظام چلانا اسی طرح ایک فنی معاملہ ہے جیسے ڈاکٹر اور قانون دان۔ افلاطون کی خیالی ''ریپبلک'' میں سماجی انصاف اور ہم آہنگی غالب اقدار تھیں تاہم اس کے نزدیک انصاف ایسا کیک نہ تھا جس پر

سبھی کا مساوی حق ہو۔لیکن وہ کمزور پر طاقت ور کا زور ماننے کی بجائے ذمہ داریوں پر زور دیتا تھا جو شہری پر اپنی ریاست کے لیے واجب الادا ہوتی ہیں۔اس کے نزدیک انصاف کا مطلب ہر شہری کا سوسائٹی کی فلاح و بہبود میں حصہ ڈالنا تھا۔تعلیم کی کفالت اور کنٹرول ریاست کے ذمے تھی۔فرائض کی ادائیگی اور تعلیم کے میدان میں مرد وزن کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہ تھا۔ریاست کے سب بچوں کی پرورش اور تعلیم اکٹھی تھی' پرائمری تعلیم کے بعد انھیں کوئی ہنر سکھانا مقصود تھا تاکہ بلوغت سے پہلے پہلے ان کی متعلقہ پیشے کی تیاری مکمل ہو جائے۔افلاطون کے استاد سقراط کے نزدیک ''علم نیکی تھی اور جہالت بدی'' لیکن یہاں پر سقراط کے نزدیک نیکی سے مراد کسی شخص کی اپنے فرائض کی کماحقہ ادائیگی تھی نہ کے اخلاقی راست بازی۔ایسے ہی افلاطون بھی چھری کی ''نیکی'' کا ذکر کرتا تھا جس سے مراد اس کا صحیح طریقے سے کاٹنے کا فنکشن ادا کرنا ہے۔اس طرح ڈاکٹر کی ''نیکی'' مریض کو مرض سے آرام پہنچانا ہے۔ہم افلاطون کے خیالات سے آج جدید زمانے کی تعلیمی پالیسیوں کو وضح کرتے وقت مندجہ ذیل مدد لے سکتے ہیں۔

(i) تیز ترقی کے لیے تقسیم کار اور منصوبہ بندی

(ii) تعلیم وتدریس میں پروفیشنل ازم پر زور

(iii) تعلیم ایک طاقت ور اوزار ہے جس سے ریاست کی تعمیر' سماجی' سیاسی اور معاشی ترقی ہو سکتی ہے۔

ریاست اپنے سامنے ایک اچھی زندگی کا تصور رکھتے ہوئے ایک قومی نظریے کو تشکیل دے۔اور قومی ترجیحات کی نشاندہی کرے اور ان مقاصد کے حصول کو یقینی بنائے جن کے لیے تعلیم نظام بنایا گیا ہے۔افلاطون تعلیم میں سیکولرازم کی حمایت کرتا ہے۔اس زمانے میں مذہب پر گرجوں' مندروں اور مسجدوں کی اجارہ داری نہ تھی۔مذہب زندگی کا ناقابل تقسیم پہلو تھا۔ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کو افلاطون کی یہ بات اچھی نہ لگے کہ بچوں کو چھوٹی عمر میں ہی ان کے مستقبل کے پیشوں میں تقسیم کر دینا چاہیے لیکن اس سے ہمیں یہ سیکھنے کو ملتا ہے کہ بچے کے رجحانات

(Aptitutes) کا پتہ لگانا ضروری ہے کہ وہ کل کیا کرے گا۔

افلاطون کے مطابق نصاب، تعلیمی سیڑھی کے ایک پائدان سے اگلے پائدان تک کا تسلسل ہے یہ تسلسل آگے کو (Progression) میں چلنا چاہیے نہ کہ ہمارے ہاں کے مطالعہ پاکستان اور اسلامیات کے مضامین کی طرح جن کا ایک جیسا مواد ابتدائی کلاسوں سے لے کر اعلیٰ پیشہ ورانہ تعلیم تک طالب علموں کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ افلاطون کہا کرتا تھا کہ تعلیم کے سارے عمل کا مقصد روح کی آنکھ کو تاریکیوں سے ہٹا کر روشنی کی طرف موڑنا ہے جس سے ایک شخص جہالت کی غار سے نکل کر علم کی تیز اور سفید روشنی (Lime Light) میں آجاتا ہے اور اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہوتا کہ ایک شخص کی روح میں علم ایسے ڈال دیا جائے جیسے خالی برتن میں پانی ڈالا جاتا ہے بلکہ تعلیم انسان کی مدد کرتی ہے کہ وہ اپنے جوہر عقل کو استعمال کر کے خود علم کو دریافت کرے۔ پہلے سے انسان جو علم حاصل کر چکا ہے۔ تعلیم کا یہ بھی مطلب نہیں کہ وہ دماغ (Mind) کو صرف نئے علم کی خوراک مہیا کرتی ہے بلکہ جو بڑی سوچ سمجھ کے بعد وضع کردہ سوالوں کے تردید یا تائیدی صحیح جوابات تلاش کرے جسے سقراطی طریقہ تعلیم بھی کہتے ہیں۔

افلاطون پہلا شخص تھا جس نے تعلیم کو رسمی سطحوں میں تقسیم کیا اور ہر سطح کے لیے عمر اور نصاب کی تخصیص کی۔ نرسری تین سے لے کر چھ سال تک جس میں زیادہ تر بچوں کے کھیل شامل تھے۔ ایلیمنٹری سطح سات سے دس سال تھی جس میں اسپورٹس، پڑھنے کے بنیادی عناصر کے ساتھ اخلاقی اور روحانی ترقی کے لیے یونانی دیومالا کی کہانیاں شامل تھیں۔ نصاب میں جمناسٹک اور میوزک بھی شامل تھا۔ ثانوی تعلیم میں اعلیٰ سطحی تعلیم کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ ریاضیات اور جیومٹری کے علاوہ نصاب ایسا تھا جس میں انسان سچائی، حسن اور خیر کا علم حاصل کر سکے۔ اعلیٰ تعلیم میں فلسفہ، اعلیٰ ریاضیات، علم فلکیات، جدلیات اور تجریدی منطق شامل تھیں اور اعلیٰ تعلیم بیس سے لے کر پینتیس سال تک محیط تھی اور یہ صرف ان کے لیے محدود تھی جنھیں ''فلاسفر بادشاہ'' بننے کی تربیت دینا مقصود تھا۔

افلاطون کے زمانے میں ''سفری استاذ'' ہوا کرتے تھے جو شہر در شہر سفر کرتے اور اپنے اس علم کی اشتہار بازی کرتے جو وہ دے سکتے تھے اور باقاعدہ اپنے مضمون کے حساب سے فیس لیا کرتے تھے۔ ایسے ماحول میں افلاطون کا ایک چھت کے نیچے باقاعدہ رسمی تعلیم کا خیال دینا ایک بڑی بات تھی۔ افلاطون پہلا شخص تھا جس نے بچے کی تعلیم کے لیے اچھے ماحول کے ہونے پر زور دیا' وہ اس بات کے لیے بھی تیار تھا کہ یونانی دیومالا (Mythology) کے قصوں کو پھر لکھا جائے اوان سے غیر مناسب اور ضرر رساں حصے نکال دیے جائیں..... یہ بات ہمیں بھی دعوت فکر دیتی ہے کہ ہم بھی اپنی پڑھائی جانے والی تاریخ اور مقدس روایات پر نظر ثانی کریں اور ان میں آج کے سائنسی شعوری دور کے مطابق ردوبدل کریں۔ افلاطون نے ایک متوازن نصاب پر زور دیا جس کا مقصد ''خوبصورت جسم اور اچھے کردار'' پیدا کرنا تھا یعنی نصاب ایسا ہونا چاہیے جو ذہن' جسمانی اور روحانی بالیدگی وصحت مندی کا ذریعہ بن سکے۔

❖.....❖.....❖

ارسطو(ARISTOTLE)

ارسطو ایتھنز کا شہری، افلاطون کا شاگرد اور کثرت سے لکھنے والا شخص تھا۔ اسے علم کے کئی میدانوں، مثلاً فزکس، بیالوجی، قانون، منطق، سیاسیات، اخلاقیات اور مابعد الطبعیات وغیرہ میں مہارت حاصل تھی۔ ارسطو کے نزدیک بچے کا ذہن ایک کچی مٹی کی مانند ہے جسے ایک صاحب عقل وشعور بالغ میں منتقل ہونا ہے جس طرح ایک بیج کے اندر مکمل درخت بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ چنانچہ تعلیم کا مقصد ایک مکمل نشوونما یافتہ اور خوش بالغ بنانے میں مدد دینا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خوشی سے کیا مراد ہے؟ ارسطو کا کہنا تھا کہ انسانی زندگی کے تمام اعمال کا بالاخر مقصد انتہائی اچھائی تک پہنچنا اور خوشی کا حصول ہے۔ اب کوئی کہے گا کہ خوشی لذت بھری زندگی میں ہے اور کسی کی خوشی طاقت واقتدار کی حصول میں مضمر ہوگی، لیکن ارسطو کے نزدیک مسرت ایک بھرپور اور سرگرم زندگی کا نام ہے جب انسان اپنی اعلیٰ ترین فطری صلاحیت کار کو استعمال میں لاتا ہے جو اس کی عقل (Reason) اور شعور (Intellect) میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ عقل اور شعور سے ہی انسان دوسرے جانداروں سے ممتاز ہوتا ہے۔ لہٰذا اچھی یا پرمسرت زندگی سے مراد انسان کا اپنی صلاحیت عقل (Intellectual Ability) کو کام میں لانا ہے۔ ارسطو کے نزدیک سرگرمی دو طرح کی ہوتی ہے۔ عملی اور نظری (Theoratical) سرگرمی کا مقصد علم اور صداقت کی دریافت کرنا ہوتا ہے۔

چونکہ انسان کو زندہ رہنے کے لیے ایک سماجی اور کاروباری زندگی گزارنی ہوتی ہے لہٰذا

تعلیم کا رول یہ ہونا چاہیے کہ وہ بچے کو ایک بہترین بالغ بنائے اور اس کی صلاحیت استدلال (Reasoning Ability) کو ترقی دے اور عملی زندگی کے لیے درکار ہنر اور دانائی پیدا کرے۔ استاد اس عمل میں ایک تخلیقی وسیلے (Agent) کا کام کرتا ہے لیکن ارسطو اس پر بھی زور دیتا ہے کہ صرف ٹیچر کا عمل ہی کافی نہیں طالب علم کی اس میں بھرپور شرکت ضروری ہے۔ وہ اس پر عمل کرے جو اس نے سیکھا ہے تاکہ وہ اس کی ذات کا حصہ بن جائے۔ اس لیے وہ کہتا ہے۔

''ہم عادل بنتے ہیں جب عادلانہ کام کرتے ہیں' ہم معتدل بنتے ہیں جب اعتدال پر عمل کرتے ہیں' بہادر بنتے ہیں جب بہادرانہ کام کرتے ہیں۔'' مختلف شکلوں کے کردار اپنے متعلق افعال کی وجہ سے تشکیل پاتے ہیں۔ اس لیے ارسطو عادت ڈالنے کے طریقے (Method of Habituation) پر زور دیتا ہے۔ معاشرتی احساس ذمہ داری پیدا کرنے کے لیے اسے عادت کا حصہ بنانا ضروری ہے۔ بچے کو صرف یہی بتا دینا کافی نہیں کہ اسے کیا جاننا اور کرنا چاہیے بلکہ استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ بچے کو بار بار ایسا کرنے کی پریکٹس کروائے جب تک کہ بچہ وہ کام خود بخود نہ کرنے لگ جائے۔ گویا ارسطو ہمارے آج کے تعلیمی اور سماجی نظام کے سب سے بڑے نقص' عمل اور عملی کام کی عدم موجودگی کا ذکر کر رہا ہے۔ تعلیم کے دوران جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ نہ ذات کا حصہ بنتا ہے اور نہ ہی وہ معاشرے میں کہیں دکھائی دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں سہل پسندی' بے عملی اور منافقت قومی مزاج بن کر ابھرتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے تعلیمی اداروں میں تھیوری کے برابر ہی عملی کام پر بھی زور دیں۔ تبھی تعلیم کے نتائج برآمد ہو سکیں گے۔ ورنہ تعلیم اپنے دونوں مقاصد میں اس طرح ناکام رہے گی کہ نہ وہ کردار سازی کر سکے گی نہ وہ ہنرمند بنا سکے گی۔ ارسطو تعلیم کو خداداد صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا ذریعہ سمجھتا تھا۔

❖.....❖.....❖

کوئنٹیلیئن (QUINTILIAN (5-95 AD

کوئنٹیلیئن روم کا رہنے والا تھا۔ وہ سقراط کی طرح قانون دان اور ایک ممتاز استاد تھا اسے تاریخ میں ریاست کی طرف سے مقرر کردہ پہلے پروفیسر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

روم میں تعلیمی ارتقاء کے تین مرحلے ہیں۔ (i) روایتی تعلیم کا زمانہ۔ (ii) یونانی ثقافت کے تعارف کا دور (iii) درآمدی نظام کے منقلب (Transformation) اور جذب (Assimilation) ہونے کا دور دیسی نظام تعلیم کا مقصد اچھے کسان شہری پیدا کرنا تھا جنھیں فوجی اور دیگر سرکاری خدمات کے لیے بلایا جا سکے۔ نصاب میں معمولی سی پڑھائی اور کم تر سطح کی لکھنے کی مشق شامل تھی۔ تیسری صدی قبل از مسیح میں جب روم نے یونان کو فتح کیا تو مال غنیمت میں یونانی تہذیب وثقافت کے بارے میں لکھی کتابیں بھی روم میں آئیں اور یونانی غلام بھی۔ جو رومیوں کے بچوں کے استاد بن گئے اور یوں یونانیوں کی تعلیمی برتری نے فاتح کو مفتوح بنا دیا۔ روم کی روایتی اور پیشہ ورانہ تعلیم پر یونان کے ادب اور دانش ورانہ (Intellectual) کلچر کا غلبہ ہو گیا' روم کے کئی شعراء نے اپنے کلام میں ایسا گلہ کیا کہ کس طرح مفتوح یونانی' رومی فاتحوں پر غالب آ گئے ہیں' گویا حقیقی آزادی اور طاقت اس بات میں مضمر ہے کہ کسی قوم کے پاس علم کتنا زیادہ ہے۔

کوئنٹیلیئن رومی تعلیم کے تیسرے دور میں پیدا ہوا۔ اس نے تعلیم پر ایک بڑی بااثر کتاب Institute of Oratory لکھی۔ جس کی بارہ جلدیں ہیں۔ اس میں بہت سے

نظریات آج بھی اتنے جدید اور عصری (Currents) دکھائی دیتے ہیں کہ کوئی بھی غلطی کھا سکتا ہے کہ اس کتاب کا مصنف بیسویں صدی کا کوئی ماہر تعلیم ہے۔ اس کے نزدیک ایک آئیدیل تعلیم یافتہ شخص ایسا ہونا چاہیے جس کی سیرت و کردار پر کوئی حرف زنی نہ کی جا سکے۔ اس نے بچے کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں والدین کی بھاری ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی یعنی بچے ابتدائی تعلیم اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے جب تک والدین خود پُر جوش دلچسپی نہ لیں، لیکن اس کے لیے والدین کو تعلیم کی افادیت کا شعور ہونا ضروری ہے چنانچہ اس نے تعلیم بالغاں کا بھی نظریہ دیا تا کہ والدین بچوں کے حوالے سے اپنا فریضہ ادا کر سکیں۔ گویا تعلیم بالغاں کا مرکزی خیال والدین کو تعلیم کی اہمیت سے آگاہ کرنا ہونا چاہیے۔

کوئنٹیلیئن کہتا ہے ''بچے کی پہلی تعلیم کھیل سے شروع ہونی چاہیے'' ''شاگرد کو سوال کرنے دو اور اس کے سوال کرنے پر اس کی تعریف کرو، اسے کسی بھی چیز کی لاعلمی میں شاداں رہنے کی اجازت کبھی نہ دو۔ جب کبھی کوئی طالب علم سیکھنے اور پڑھنے پر رضامند نظر آئے تو کسی دوسرے طالب علم کو پڑھانا شروع کر دو جس سے وہ حسد رکھتا ہو۔ اسے دوسروں کے ساتھ مقابلہ بازی (Competition) پر لگاؤ..... تا کہ وہ خود کو بھی جیتا ہوا دیکھنے کی کوشش کرے۔ استاد کو چاہیے کہ وہ بچوں کو انعامات دے تا کہ اس کے پڑھنے لکھنے کے شوق کو مہمیز مل سکے۔ بچے چھوٹی عمر میں انعامات کے حصول کے بہت متلاشی ہوتے ہیں'' حیرت کی بات ہے کہ اس نے قبل از مسیح وہ تھیوری پیش کی جسے بیسویں صدی کی (Theory of Reward in Learning) کہا جاتا ہے اور جس کو B.F. Skinner نے پیش کیا تھا تا کہ مناسب انعامات کے ذریعے تعلیمی عمل کو تقویت دی جا سکے۔ مذکورہ خیالات کے حوالے سے اگر ہم اپنے تعلیمی مدارس کو دیکھیں تو ہر نکتے پر ایک مایوس کن صورت حال نظر آتی ہے۔ نہ تو ابتدائی جماعتوں میں بچوں کے کھیل ہی کھیل میں سیکھنے کا کوئی مناسب بندوبست ہے، نہ ہی کھیل کے عمل کو ٹیکسٹ سلیبس کے ساتھ ضم (Incorporate) کیا گیا ہے اور جہاں تک سوالات کرنے پر طلباء کی حوصلہ افزائی کرنے کا

تعلق ہے تو سوالات کو تو ہمارے اساتذہ نہ ہضم کر سکتے ہیں، نہ برداشت اور نہ ہی مناسب جواب دینے کی کوئی صلاحیت یا تربیت رکھتے ہیں۔ فیوڈل اثرات کے تحت ہمارا سماجی مزاج ہی ایسا ہے کہ ہم مختلف نقطہ نظر اور سوال کو برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ہمارا ٹیچر بھی ہمارے معاشرے کا فرد ہے۔ وہ خود کئی شخصی اور نفسیاتی کمپلیکس (Complex) کا شکار ہوتا ہے۔ دوسرے سوال کی اجازت دینے سے پہلے خود ایک متوازن فکر و شعور کا حامل ہونا ضروری ہے۔ جب کہ ہمارے ہاں حیات و کائنات کے بارے میں جامد (Fixed) نظریات رائج ہیں۔ جنھیں دنیا کی آخری سچائی قرار دے کر مزید بحث و تجزیہ بے کار بلکہ اشتعال انگیز سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ ہمارا سماجی نظا ایسا ہے جس میں ہر طاقت ور کمزور کو دباتا ہے چنانچہ کلاس روم میں استاد اپنے کو طاقت ور اور اعلیٰ و برتر پوزیشن میں سمجھتا ہے لہٰذا وہ طلباء کو سوال کرنے یا کسی موضوع پر کھلی بحث کی اجازت کیسے دے گا۔ کہیں سوال ایمان کو خطرے میں ڈال دیں گے اور کہیں حب الوطنی کا مسئلہ درپیش ہو جائے گا۔ ہمارا استاذ نوجوانوں میں سوچنے سمجھنے کی ایسی صلاحیتیں پیدا کرنے کی بجائے کہ وہ حق و باطل کا امتیاز کر کے خود قابل ہو سکے، وہ نظام کہنہ (Status Que) کا محافظ بن کر سامنے آتا ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا استاد اگر طالب علم کو سوال کرنے کی اجازت دے گا تو پھر استاد کو بھی محنت کرنا پڑے گی۔ اسے بھی اپنا مطالعہ وسیع کرنا پڑے گا اور استاد کو کیا مصیبت پڑی ہے محنت اور مشکل کام میں پڑنے کی جس کی ہمارے معاشرے میں روایت ہی نہیں ہے۔ سوال کی اجازت دینے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے نوجوان پر اعتماد کریں۔ اس کو سنیں کہ وہ کیا محسوس کرتا ہے۔ اس کی آزادانہ رائے کو سامنے آنے دیں۔ لیکن ہمارا قومی، سیاسی، سماجی اور مذہبی فکری نظام خوف پر استوار ہے۔ ہمیں لاشعوری طور پر احساس ہے کہ جوں ہی مخالفانہ رائے یا سوال سامنے آیا..... ہمارا سارا فکری نظام دھڑام سے نیچے آ گرے گا۔ ہمیں خود پر اعتماد نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے خود یہ فکری نظام کسی استدلال کی فضا میں قبول نہیں کیا ہوا بلکہ بند، یک طرفہ اور آمرانہ ماحول میں اپنایا ہوتا ہے۔ نئی رائے سے ڈرتے ہیں، تجربے سے خوف کھاتے ہیں۔

یہی حال میرٹ پر انعام (Reward) دینے کا ہے۔ ہمارے اسکولوں میں بہت کم اسے بطور پالیسی اختیار کیا جاتا ہے۔ دوسرے ممالک کے اسکولوں میں دیکھا گیا ہے کہ وہ جابجا تعلیم کی ہر سطح پر تقسیم انعامات اور حوصلہ افزائی کے لیے خصوصی سرٹیفکیٹ بچوں کی اعلیٰ تعلیمی کارکردگی پر دیتے ہیں۔ کلاسوں اور اسکول میں پوزیشن لینے والوں کی تصویریں نمایاں طور پر لگائی جاتی ہیں' لیکن اپنے پاکستانی اسکول میں اس طرح کے تکلفات کی کوئی جگہ نہیں۔ کبھی کوئی ٹیچر از خود اپنی جیب سے بچے کی کارکردگی دیکھ کر کوئی انعام دے دے گا بلکہ حد یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں سے وظائف کا سلسلہ بھی بند ہے۔ ایک ٹی وی پروگرام میں اسلام آباد یونیورسٹی کے ایک صدر شعبہ نے بتایا کہ جو لوگ پی۔ ایچ۔ ڈی کرتے ہیں' ان کی امداد کے لیے ہمارے پاس کسی وظیفے کا کوئی بندوبست نہیں۔ یعنی اگر نوجوان ایم اے کرنے کے بعد تعلیم کو جاری رکھنا چاہے تو پی ایچ ڈی کے لیے مزید چار پانچ سال وہ ماں باپ پر بوجھ بنا رہے۔ اس وطن' ریاست' اور معاشرے کے پاس تحقیق کرنے والے کے لیے معمولی وظیفہ بھی دینے کو نہیں ہے چنانچہ بہت سے طلباء ایم فل اور پی ایچ ڈی کے دوران مناسب نوکری ملنے پر تعلیم کا سلسلہ ترک کر دیتے ہیں۔

کوئینٹیلیئن کا کہنا تھا کہ اساتذہ کو اپنے طلباء سے والدین کا رویہ اپنانا چاہیے اور خود کو ان کا نمائندہ سمجھنا چاہیے جنھوں نے بچوں کو اچھے مستقبل کے لیے ان کے حوالے کیا ہوتا ہے۔ استاد کو خود بھی برائی سے بچنا چاہیے اور طلباء کو بھی غلط رویوں سے باز رکھنا چاہیے وہ (ضوابط کے معاملے میں) سخت گیر تو ہو سکتا ہے لیکن تند خو مزاج نہیں۔ وہ خوش طبع تو ہو سکتا ہے لیکن بے تکلف نہیں' اسے اپنے مزاج پر ضبط ضرور ہونا چاہیے لیکن ان غلطیوں سے اغماز نہیں برتنا چاہیے جن کی تصحیح کرنا ضروری ہے' اسے بلا روک ٹوک سوالوں کے جواب دینے چاہئیں اور ان طلباء سے سوال کرنے چاہئیں جو سوال نہیں پوچھتے۔ وہ جب اپنے شاگردوں کے کام کی تعریف کرے تو نہ اسے بخل سے کام لینا چاہیے اور نہ ہی اسے معقول حد سے متجاوز ہونا چاہیے۔ اگر وہ تعریف میں بخیلی سے کام لے گا تو ان میں کام سے نفرت پیدا کر دے گا اور اگر بڑھ چڑھ کر تعریف کرے گا تو ان

کے جذبہ آسودہ خاطری (Spirit of Self complacency) کو ٹھیس پہنچائے گا۔ دوسروں کی خطاؤں کی تصحیح کرتے وقت اسے سخت گیر نہیں ہونا چاہیے نہ اسے دشنام دہی، بیہودہ اور غیر مہذب زبان کا استعمال کرنا چاہیے۔

اب ذرا ہمارے مدرسوں میں آج کے زمانے میں طلباء کے ساتھ اساتذہ کی زبان ملاحظہ فرمایئے۔ مندرجہ ذیل تمام واقعات اور مکالمے بچوں نے خود رپورٹ کیے ہیں۔

.....ہمارے کیمسٹری کے ٹیچر ہر وقت گالیاں دیتے رہتے ہیں مثلاً ''اوئے کمینے'' ''کمینے کہیں کے'' ''ادھر آ ذرا میں تمہاری چمڑی اتاروں'' ''آپ کو میرا پتہ نہیں، جب میں مارتا ہوں تو پھر ہڈیوں پر مارتا ہوں'' ''جوتا اتار کر تیرے منہ میں ماروں گا۔''

.....سائنس کی ٹیچر کے پاس جب کاپیاں لے کر آئے تو انھوں نے کہا، ''ایک تو یہ چڑیلیں میرے پیچھے پڑ گئی ہیں''

.....ہماری ایک بیالوجی کی ٹیچر جب کلاس میں آتی ہیں تو سب سے پہلے ماتھے پر ایسے بل ڈالتی ہیں جیسے وہ کسی سے جھگڑا کر کے آئی ہوں اس کا بچوں پر اتنا برا اثر پڑتا ہے کہ انھیں وہ مضمون پڑھنے میں دلچسپی نہیں رہتی۔

.....ہماری ٹیچر کا ڈائیلاگ ہے ''تمہاری آنکھیں ہیں یا بٹن''

.....ایک بچی نے قدرے بڑے سائز کا ہیئر کلپ لگا رکھا تھا تو ٹیچر نے نہایت اہانت آمیز لہجے میں کہا ''آج تم گوبھی کا پھول لگا کر آئی ہو، شرم نہیں آتی فیشن کرتے ہوئے''

.....ہمارے ایک فزکس کے ٹیچر ہر وقت بڑبڑاتے رہتے ہیں (جیسے دل ہی دل میں کسی کو گالیاں دے رہے ہوں..... بچے کے خیال کے مطابق) ایک لڑکا دوسروں سے پوچھتا ہے وہ ایسا کیوں کرتے ہیں، تو سب نے جواب دیا کہ وہ ہر وقت رٹا لگاتے رہتے ہیں!!

کونٹیلیئن اسکولوں میں جسمانی سزا دینے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کرتا ہے ''ایک چیز ہے جسے میں بالکل ناپسند کرتا ہوں، حالانکہ روایت (Custom) نے

اس کی اجازت دے رکھی ہے وہ ہے بچوں کو چھڑی سے مارنا' سرزنش کا یہ طریقہ مجھے گھٹیا' غلاموں کے ساتھ برتاؤ جیسا اور بے ہودہ لگتا ہے اس میں بچہ ڈھیٹ ہو جائے گا'' آگے چل کر وہ ایک بڑا شاندار سوال اٹھاتا ہے'' اگر ایک بچے کو ٹھیک کرنے کے لیے مارنے کے سوا کوئی دوسرا رستہ نہیں تو پھر ایک بالغ کے ساتھ کیا کیا جائے گا جسے اس طرح کی سزا کا کوئی خوف نہ ہوگا جب کہ اس نے زیادہ اور مشکل چیزوں کو سیکھنا ہے۔''

❖.....❖.....❖

کومی نئیس COMENIUS(1592-1670)

کومی نئیس 1592ء میں آج کے چیکوسلواکیا میں پیدا ہوا تھا وہ ایک تعلیمی مصلح اور تجربہ کار استاد تھا۔ وہ تعلیم کے قدیم کلاسیک اور نئے خیالات کے بیچ ایک سیڑھی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یورپ کے دور سیاہ (Dark Age) میں اقتدار کی جنگوں اور بدعنوانیوں (Corruption) کی وجہ سے مملکتیں تباہ اور نظام تعلیم برباد ہو چکا تھا پھر ازمنہ وسطی کا زمانہ آتا ہے۔ دور سیاہ نے چونکہ کوئی علمی اثاثہ پیدا نہیں کیا تھا چنانچہ ثقافتی افراتفری اور علمی خلا کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چرچ نے تعلیم پر قبضہ کر لیا تا کہ مذہب کو پھیلایا جا سکے چنانچہ تعلیم پر ایک ہزار سال تک مذہبی پیشواؤں کی اجارہ داری رہی۔ انکے مذہبی مدرسوں کا مطلب اتنا ہی تھا کہ لوگ عبادت میں شریک ہو سکیں۔ پھر مشہور صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا' مشرق وسطیٰ اور اسپین کے علمی مراکز جنگجوؤں کے ہاتھ لگے اور وہاں سے قدیم یونانی اور رومی مصنفوں کے قلمی نسخے اور عربوں کے ھند سے یورپ لے آئے۔ نتیجہ کے طور پر فلاسفی' ریاضیات اور دیگر سائنسی علوم کی ترقی کا آغاز ہو گیا' تعلیم کے ارتقاء میں دوسرا اہم واقعہ اٹلی اور پیرس میں یونیورسٹیوں کا قیام تھا اور وہ جلدی اسپین اور قاہرہ کی اسلامی یونیورسٹیوں سے بہت آگے نکل گئیں۔ یہاں دور ونزدیک سے طلباء آتے رہے اور ان ابتدائی یونیورسٹیوں کے علم کے چشموں سے سیراب ہوتے رہے' یونیورسٹی کا لفظ پرانے لاطینی لفظ ایسوسی ایشن (Univeritas) سے نکلا ہے کیونکہ استادوں اور طلبا کے گروپ بنتے گئے' تعلیم پر مذہبی اداروں کا کنٹرول کم ہوتا گیا۔ تعلیم کے متلاشی لوگ علم کے حصول کے لیے خود کو آزاد سمجھنے لگے اور

یہ نظریہ بڑھتا گیا کہ علم اور صداقت ہر میدان میں حاصل کی جاسکتی ہے.....ان میدانوں میں بھی جہاں مذہبی پیشواؤں نے اپنے جملہ حقوق محفوظ کرر کھے تھے۔ پندرھویں صدی میں پرنٹنگ پریس ایجاد ہوئی تو پرنٹ میڈیا مذہبی کاہنوں کی اجارہ داری سے آزاد ہوگیا اب اصلاحات کا دور شروع ہوتا ہے۔

یہ تھا وہ پس منظر جب کومی نیئس ایک تعلیمی مفکر کے طور پر سامنے آتا ہے وہ دینیات کا ماہر بھی تھا اس کے خیال میں سب جاندار اور غیر جان دار چیزیں انسان کے لیے بنی ہیں جیسے ارسطو نے کہا تھا' ''انسان ہی فطرت میں سب چیزوں کا مرکز ہے۔'' انسان کی عقل' فطرت (Nature) اور خدا دونوں کے بارے میں جاننے کی صلاحیت رکھتا ہے لہٰذا تعلیم ہر ایک کا پیدائشی حق ہے' انسان ایک بیج کی طرح ہے اور نصاب کی حیثیت وہی ہے جیسی بیج کے لیے زمین اور استاد یا طریقہ تدریس فطرت کے مشابہ کردار ادا کرتے ہیں۔ کومی نیئس کا کہنا تھا' ''ہماری پہلی خواہش سب کا مکمل طور پر پڑھا لکھا ہونا چاہے۔ تعداد کا کوئی سوال نہیں کہ تھوڑے تعلیم یافتہ ہونے چاہیے یا زیادہ۔ ساری نسل انسانی' تمام عمروں اور ہر طرح کے حالات میں رہنے والے تذکیر و تانیث کی تمیز کے بغیر اور تمام اقوام کے لوگ پڑھے لکھے ہونے چاہیں'' ایک دوسری جگہ اس نے کہا' ''تعلیم سے کوئی محروم نہیں رہنا چاہیے سوائے فاتر العقل کے'' حتیٰ کہ اس نے معذوروں کی تعلیم کے لیے خصوصی توجہ کی ضرورت پر زور دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ جتنا کوئی کمزور اور احمق بچہ ہے اتنی وہ زیادہ توجہ کا مستحق ہے! کوئی دماغ فطرت نے اتنا کمزور پیدا نہیں کیا جو تعلیم سے ٹھیک نہ ہوجاتا ہو.....اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کومی نیئس یونیورسل اور مقبول عام تعلیم کا زبردست داعی تھا۔ وہ کسی بھی حالت میں کسی بھی انسان کو تعلیم سے محروم نہیں دیکھ سکتا تھا.....اس لیے کہ وہ جان چکا تھا کہ ان پڑھ اور فاتر العقل ہونا.....ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں بات کو آگے بڑھا کر دیکھا جائے تو ایک المناک نتیجہ سامنے آتا ہے کہ ہمارے پالیسی سازوں نے ملک کی 80 فیصد آبادی کو فاتر العقل کے برابر درجہ دے رکھا ہے۔

کومی نیئس نے ایک ''انٹرنیشنل کالج'' کا بھی تصور دیا جس کا مقصد تعلیم کے ذریعے بین الاقوامی افہام وتفہیم، امن اور ہم آہنگی کو فروغ دینا تھا۔ یاد رہے کہ یہ کام آج اقوام متحدہ کا ادارہ یونیسیف انجام دے رہا ہے۔ اس نے اس کا نام ''کلیہ نور'' (College of Light) رکھا تھا۔ اس نے کہا تعلیم کو جمہوری بنانے اور ہر ایک کو تعلیم کے مساویانہ مواقع دینے کی ذمہ داری ریاست کی ہونی چاہیے اسے یقین تھا کہ اگر ریاست تعلیم کی رسائی ممکن بنائے تو ہر شخص تعلیم یافتہ ہوسکتا ہے۔

اس نے طریقہ تدریس اور ٹیچروں کے لیے کچھ راہنمایانہ اصول بھی بنائے کیونکہ ایک صحیح طریقہ تدریس ہی پڑھانے کے عمل کو تیز کفایت انگیز اور مؤثر بنا سکتا ہے۔ اس نے اپنے بنائے ہوئے مندرجہ ذیل اصولوں پر خود بھی اس کلاس روم میں عمل کیا۔

☆ بچے عام طور پر متجسس ہوتے ہیں اس لیے وہ فطری طور پر سیکھنے کے لیے تیار ہوتے ہیں بشرطیکہ ایسا کرنے کا فوری مقصد ان کے سامنے رکھا جائے۔

☆ بچوں کو آنسوؤں، مار پیٹ اور دباؤ کے بغیر پڑھانا ہوگا۔ مار پیٹ سے اسکول کی محبت قائم نہیں ہوسکتی بلکہ قطعی ممکن ہے کہ اسکول سے نفرت اور بیزاری پیدا ہو جائے۔ اگر بچہ تعلیم میں بدمزگی محسوس کرنے لگے تو اس کا علاج کرنا چاہیے۔ مطالعہ کی محبت طلباء میں پیدا کرنی چاہیے اگر ہم نہیں چاہتے کہ ان کی پڑھائی سے لاتعلقی، مخاصمت میں اور کاہلی، کند ذہنی میں بدل جائے۔

☆ بچوں کو اس طریقے سے پڑھانا چاہیے کہ ان کے سب حواس (Senses) استعمال ہوں سمعی، بصری اور دیگر ہر طرح کی تدریسی اشیاء (Learning Aids) مہیا ہونی چاہیے، کتابیں تصویروں سے مزین ہونی چاہیے۔

☆ یادداشتی کام (Memory Work) بہت کم ہونا چاہیے اور اگر کسی پیراگراف کو یاد کرنا مطلوب بھی ہے تو ٹیچر کو پہلے اس کی اچھی طرح وضاحت کرنی چاہیے اور طلباء کو بھی اس کے معنی ومفہوم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

بچے کو وہ پڑھایا جائے جو اس کی عمر اور ذہنی سطح سے مطابقت رکھتا ہو۔ یہ اس کی ذہانت کے ساتھ تشدد ہوگا اگر اسے وہ پڑھنے پر مجبور کیا جائے جو اس کی عمر اور صلاحیت کار سے بڑھ کر ہے۔

☆ مضامین ارتقاء پذیر یعنی (Progression) میں چلنے چاہیں۔ سبق معلوم (Known) سے نامعلوم (Unknown) کی طرف چلنا چاہیے۔ نئی اور مشکل چیزیں تسلسل سے اوپر کو جانی چاہئیں۔ آسان وسادہ سے مشکل و پیچیدگی کی طرف سفر ہونا چاہیے۔

☆ کسی ایک سطح پر پڑھائے جانے والے مضامین کے درمیان باہمی رابطہ (Interconnection) ہونا چاہیے۔ مضامین کے ترتیب و امتحانات میں ایک عمودی (Vertical) اورافقی (Horizental) اتحاد (Unity) ہونا چاہیے۔

☆ کلاس روم روشن، صاف ستھرا اور خوشگوار اور اچھے فرنیچر سے مزین ہونا چاہیے اور اسے تعلیم سے متعلق سجاوٹی سامان سے آرائش ہونا چاہیے۔ سارا ماحول اتنا پرکشش ہو کہ بچہ جدھر کو دیکھے اسے کچھ نہ کچھ سیکھنے کو ملے۔

☆ اسکول کو مسرت کا گہوارہ 'house of Joy' ہونا چاہیے نہ کہ اذیت گھر، مدرسے کے گردوپیش کا ماحول (Surrounding) خوبصورت، خاموش اور اچھے مناظر کا حامل ہونا چاہیے۔

☆ سارے تعلیمی ڈھانچے کی درجہ بندی نہایت احتیاط سے ہونا چاہیے جو طالب علم کی عمر اور ذہنی نشوونما کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو اور پڑھانے کا طریقہ بھی اس کی صلاحیت تفہیم کے برابر ہونا چاہیے۔

کومی نیئس کے بتائے گئے تمام نکات پانچ سو سال گزرنے کے بعد آج بھی تروتازہ ہیں جب کہ ہمارے بیشتر مدرسے، نصاب اور ان کا طریقہ تدریس سو سال پہلے والے زمانے سے بھی زیادہ پس ماندہ نظر آتا ہے۔ ہمارے مدرسوں میں آج بھی رٹا، مار پٹائی، بے محل، غیر متعلق اور خشک نصابی مواد، شکستہ عمارتوں کا بوسیدہ ماحول جیسے مسائل کومی نیئس کے بتائے گئے تعلیمی ماحول اور

اصولوں کا مذاق اڑاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔کومی نیئس کے بارے کہا جاتا ہے کہ تعلیم کی قوت (Education Power) پر ایمان رکھنے والا اس سے بڑا شخص اور کوئی نہیں گزرا یہی وجہ ہے کہ کومی نیئس جنون کی حد تک تعلیم کی اہمیت پر بہ تکرار اور غیر معمولی طور پر اصرار کرتا نظر آتا ہے۔

❖.....❖.....❖

روسو

(JEAN-JACQUESROUSSEAU)(1712-1778)

فرانس کے اس مشہور مفکر و فلاسفر نے معاشرے کے ان اثرات پر حملہ کیا جو فرد کو آزادی سے محروم اور اسے مروجہ سماجی نظام (Social Order) کی تعمیل پر مجبور کرتے ہیں۔ ہمارے جیسے فیوڈل اور پس ماندہ معاشرے میں فرد کی آزادی فکر و عمل کچلنے کا رواج اپنی انتہا پر ہوتا ہے اور ان معاشروں کے نظام تعلیم کے پیچھے فلسفہ بھی یہی کارفرما ہے کہ فرد کی آزادانہ سوچنے سمجھنے اور اپنی رائے خود قائم کرنے کی صلاحیت کو دبا دیا جائے۔ روسو کا کہنا تھا کہ سماج اپنی اصلی ساخت سے اس قدر دور آ چکا ہے کہ اب اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اب پھر اسے ایک صاف سلیٹ کی ضروت ہے تا کہ انسان کی اصلی معصومیت واپس لائی جا سکے لیکن اس کے لیے ایک مناسب تعلیمی نظام وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ روسو سماج کے ہاتھوں انسان کی کونسی معصومیت کے لٹ جانے کی بات کرتا ہے۔ اس کا تجربہ اور مشاہدہ اپنے معاشرے میں بخوبی کیا جا سکتا ہے جہاں انسان فطری عمل کی پیداوار نہیں بلکہ ''خصوصی مخلوق'' بن چکا ہے۔ بچے کو پیدا ہوتے ہی اپنے اپنے عقائد اور اصولوں کی زنجیریں پہنا دینے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اب وہ فطرت کا پیدا کردہ معصوم انسان نہیں رہتا جو اپنی زندگی کی راہوں کو فطری عمل اور حالات و واقعات کے مطابق تشکیل دے ..... بلکہ معاشرے کے بتائے ہوئے متعصب اور یک طرفہ نظریات کا حامل بن جاتا ہے۔ وہ فطرت کا بنایا انسان نہیں اپنے سماج کے ہاتھوں تشکیل کردہ

ربوٹ ہوتا ہے چنانچہ روسو کو ایک بدلے ہوئے تعلیمی نظام میں روشنی کی کرن نظر آئی۔

روسو نے ناول کی طرز پر کتابیں لکھیں اور ان کہانیوں میں اپنے نظریات کے مطابق کردار تخلیق کیے۔ چنانچہ اس کے تعلیمی نظریات کا سراغ بھی ہمیں اس کے انھی کرداروں میں ملتا ہے افلاطونی نظریہ تعلیم میں بچہ کو بالغ شخص کی چھوٹی تصویر (Miniature) سمجھا جاتا تھا اور بچپن کا مطلب ''ناسمجھی'' کا زمانہ تھا جسے گزر جانا ہے لیکن روسو نے بچپن کو معصومیت سے تعبیر کیا اور کہا کہ بچے کو اپنی دلچسپیوں کے مطابق اسی دور سے لطف اندوز رہنے کے لیے چھوڑ دینا چاہیے تاکہ اسے اپنے تجربات سے سیکھنے کا موقع مل سکے۔ اس مرحلے پر تعلیم کا مقصد بچے کو دور مستقبل کے بالغ پن کے لیے تیار کرنا نہیں بلکہ بچے کی ان صلاحیتوں کو ترقی دینا ہونا چاہیے جن سے وہ اپنے وقت کی ضرورتوں اور مسائل سے نبٹ سکے۔ بات آگے بڑھانے سے پہلے آیئے اپنے معاشرے میں ادھر ادھر نظر دوڑا کر دیکھتے ہیں کہ ہم ذہنی لحاظ سے بوڑھے لوگ مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے نام پر اپنے بچوں سے ان کا بچپن اور معصومیت چھین لیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو زبردستی صوم وصلوٰۃ کا پابند بنانا شروع کر دیا جاتا ہے۔ چند سال کی بچی سے پردے اور دوپٹے کی پابندی کروائی جاتی ہے اسے بڑی عورتوں کی طرز کا لباس پہنا کر وہی چال ڈھال اپنانے کو کہا جاتا ہے۔ سمٹی سمٹائی باپردہ بچی..... یہی حال بچے کا کیا جاتا ہے۔ سر پر ٹوپی پہنے بڑوں جیسے لباس میں ملبوس..... ہر وقت وضو، نماز اور مسجد کے چکر میں یا پھر لمبے لمبے مقدس متن بلا سوچے سمجھے رٹنے پر زور..... بچپن سے ہی بچوں اور بچیوں کو آپس میں کھیلنے کودنے سے منع کرنا..... اسکول، ہوم ورک کے بعد جو فارغ وقت بچتا ہے اس میں ایک دقیانوسی مولوی بچوں کو ''عربی وقرآن'' پڑھانے پر لگا دیا جاتا ہے۔ بچے کی شخصیت کو برباد کرنے کی رہی سہی کسر وہ نکال دیتا ہے۔

فطرت نے بچے کو معصوم پیدا کیا..... اس میں بے داغ خود روی (Spontaneousness) پیدا کی ہوتی ہے۔ کئی طرح کے احساس گناہ اور (Complexes)

میں مبتلا ہم بالغ لوگ بچوں کی اس معصومیت کو برداشت نہیں کر پاتے جو کام ہمیں کرنے تھے یا کرنے ہوتے ہیں ان کا پابند بچوں کو بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ بچے بچے نہیں رہتے وہ معاشرے کے بالغ افراد کی چھوٹی چھوٹی مورتیں 'MINIATURES' بن جاتے ہیں۔ بچی بڑی بی کا روپ اور بچہ بڑے میاں کا انگ اپنا لیتا ہے۔ بڑوں نے تو زندگیاں دوہرے معیاروں میں گزار دی ہوتی ہیں لہٰذا ان کا اپنا احساس گناہ معصوم بچوں پر ساری اخلاقیات نافذ کر دیتا ہے اور ہر آن بدلتا وقت اس جہالت در جہالت کے انتقال کی وجہ سے اس رکے معاشرے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ صدیاں بیت جاتی ہیں ایسی قومیں اپنے فکر و عمل میں وہیں کی وہیں کھڑی رہتی ہیں اور حرکت پذیر قوموں کی ترقی پر تلملاتی رہتی ہیں' آگے دیکھنے کی بجائے وہ اپنی پس ماندگی کی وجہ اس میں دیکھتے ہیں کہ ابھی بچوں پر پورا اخلاق نافذ نہیں ہوا۔ یوں یہ معاشرے اپنی غیر سائنسی سوچ کی وجہ سے اخلاقیات اور انسانیت دونوں سے کھوکھلے ہوتے جاتے ہیں۔ ترقی یافتہ اور فخر یافتہ قوموں نے انھی عظیم مفکروں کے خیالات پر چل کر اپنی زندگی کے دھاروں کو تبدیل کیا تھا۔

روسو کا کہنا تھا کہ بچوں کو کتابوں کے رٹے نہیں لگوانے چاہئیں اور نہ ہی اسے حکم دیا جانا چاہیے یا مجبور کرنا چاہیے' ایک ایسے کام پر جس میں اس کی دلچسپی نہیں ہے۔ ذرا پاکستان کے ان مذہبی مدرسوں کا نقشہ سامنے لائیے جہاں بچوں کے پاؤں میں زنجیریں (Chains) پہنائی جاتی ہیں کہ مبادا وہ مذہبی تعلیم سے بھاگ نہ جائیں (یاد کریں بی بی سی کی وہ فلم جو ساری دنیا میں دکھائی گئی) روسو اسے بڑوں کی ضرورت سے زیادہ پریشانی (Over Concern) قرار دیتا ہے جو بچوں کو جوانوں جیسا دیکھنا چاہتے ہیں بڑوں کا یہ رویہ بچے کی ترقی کے فطری عمل میں رکاوٹ اور اس کی فطری تعلیم کو مسخ اور خراب کرتا ہے۔ روسو اس بات پر زور دیتا ہے کہ بچہ فطری طور پر اچھا ہوتا ہے اور بڑوں کی مداخلت کے بغیر اسے بڑا ہونا چاہیے۔ روسو کی اس بات کے غلط مطلب نہیں لینے چاہئیں' یہ بات بالکل صاف ہے کہ وہ کسی قسم کی مداخلت کر رہا ہے۔ پرانا عیسائی تصور تھا کہ انسان پیدائشی طور پر گناہ گار اور بے ادب ہے۔ چنانچہ انسانی بچے کو ''ٹھیک کرنا'' نہایت ضروری ہے۔ یہ تصور صرف عیسائی مذہب کا ہی مسئلہ نہیں تھا' آدم کے مائل بہ گناہ گار ہونے کا عقیدہ ہمارے بھی تحت شعور میں جاگزیں ہے۔ روسو نے اس کے مقابلے

میں کہا کہ انسان پیدائشی طور پر معصوم اور اچھا ہے۔

روسو بچے کی پہلے 12 سال کی عمر تک ''منفی تعلیم'' (Negative Education) کی تجویز پیش کرتا ہے' اس سطح پر تعلیم کا مقصد ''سچائی اور نیکی'' کی تدریس نہیں ہونا چاہیے' بلکہ اس کے دل کو برائی (Vice) سے اور دماغ کو خطا (Error) سے محفوظ بنانا ہونا چاہیے۔ اگر کوئی اس سے یہ مطلب لیتا ہے کہ روسو کسی طرح کی تدریس (Instruction) کے خلاف تھا تو ایسا سوچنا غلط ہے' بلکہ اس کا کہنا تھا کہ بچے کو صداقت اور نیکی کا علم خود اس کے اپنے تجربات کی وساطت سے سیکھنے کی اجازت ہونی چاہیے' صداقت و نیکی کے بارے میں بڑوں کے خیالات بچوں کے لیے بہت قبل از وقت ہوں گے' لہٰذا انھیں ان پر نہیں ٹھونسنا چاہیے' اسے آزمائش اور خطا (Trial and Error) کے عمل سے سیکھنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ جب کہ ہم بچے کے سامنے بنے بنائے اخلاقی اور نظریاتی اصول رکھ دیتے ہیں' جن کے بارے میں نہ اسے کوئی تجربہ ہوتا ہے اور نہ اس عمر میں وہ اس کا مسئلہ ہوتے ہیں' نہ صرف ہم اسے بے وقت اور غیر متعلقہ علم دے رہے ہوتے ہیں بلکہ زیادتی یہ ہے کہ اسے ان کو دنیا کی آخری صداقت کے طور پر ماننے پر مجبور کرتے ہیں' جہاں ہمیں بچے کو اس کے اپنے اعمال اور غلطیوں سے سیکھنے کا موقع دینا ہے' وہاں ایسی غلطیوں سے باز ضرور رکھنا ہے جو اس کے لیے بہت مہنگی ثابت ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اسے ''یہ کرو'' اور ''یہ نہ کرو'' کے چکر میں ڈال کر سیکھنے کے عمل سے ہی باغی نہیں کر دینا چاہیے۔ روسو بچے کے لیے ایک ایسی آزادی چاہتا ہے جس میں وہ کھیل کود کر سکے' اپنے دل سے کھیلے یا کام کرے نہ کہ مسلسل بڑوں کی عاید پابندیاں اس کی اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر دیں۔ بچے کو حقیقی حالات (Situations) میں آزادی کی حدود کو بھی سیکھنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اسے اس عمر میں کتابیں اس وقت تک نہیں دینی چاہئیں جب تک وہ انہیں خود نہ مانگے اور جب تک وہ تیار نہ ہو۔ روسو کی اس بات سے ہمیں پرائمری اسکول کے بچوں کے بھاری بھرکم بستوں کا وزن کم کرنے کے بارے میں سوچنا چاہیے' ہمیں بچے کو بچہ ہی سمجھنا چاہیے' اس میں مذہب' اخلاق' قومی مسائل اور سیاسی نظریات کی ٹھونسا ٹھانسی نہایت ہی ناجائز حرکت ہے۔ ہم بچوں کو خشک مضامین اور تجریدی مسائل سے بھری نصابی کتابیں پکڑا دیتے ہیں' جن میں بچے کے حوالے سے کسی اور ہی دنیا کی باتیں رقم ہوتی ہیں' اس عمر میں بچے کو وہ پڑھائیں جو اس کی عمر اور ماحول سے مطابقت رکھتا ہو۔

روسو کے مطابق پرائمری سطح تک مذہب اواخلاقیات کی نہ تعلیم ہونی چاہیے نہ تبلیغ' روسواس کے جواب میں بڑی عقلی دلیل فراہم کرتا ہے۔اس کا کہنا تھا کہ مذہبی عقاید اور حرام حلال کے مسائل کا تعلق تجریدی (Abstract) سے ہے' لہٰذا وہ بچے کی سمجھ بوجھ سے پرے کے سوالات ہیں۔ ہمارے معاشرے کا یہ پہلو بڑا مضحکہ خیز اور منافقانہ ہے جس میں ہم بڑے تو اخلاقیات سے فارغ ہو چکے ہیں اور ساری اخلاقیات کو بچوں میں پورا کرنا چاہتے ہیں۔روسو کہتا ہے کہ اس عمر میں اور بچہ رضا کارانہ طور پر استاد یا والدین سے مذہب کے بارے میں کوئی سوال کرتا ہے تو اس کے بارے میں بتانے میں کوئی حرج نہیں' اس پر عقاید کی بمباری سے پرہیز کرنا چاہیے' جب بچہ مذکورہ تعلیم وتربیت کے بعد 15 سے 25 سال کی عمر کا نوجوان ایک فرد کا کردار ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے' تب اسے سوشل تعلیم دی جاسکتی ہے' اب اسے خاندان' معاشرے' ملک وملت کے سیاسی نظریات' مذہب اور اخلاقیات کی تعلیم دینے میں کوئی حرج نہیں۔

روسو بھی دیگر تعلیمی مفکرین کی طرح اس بات کا حامی تھا کہ عوام کے تعلیمی اخراجات کی کفالت اور تعلیمی سہولتوں کی فراہمی کا ذمہ دار ریاست کو ہونا چاہیے۔روسو کے افکار سے آج کے تناظر میں مندرجہ ذیل نکات ہمارے غور وفکر کا مرکز ہو سکتے ہیں۔

☆ زندگی بذات خود بھی انسان کو سکھاتی ہے' چنانچہ ایک رسمی مدرسے اور کلاس روم میں جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے' تعلیم اس سے کہیں زیادہ کا نام ہے' اسکول کے اندر اور باہر کا سارا ماحول تدریس کا منبع ہوتا ہے۔

☆ نصاب (Curriculum) اور طریقہ تدریس (Teaching Method) کا تعین بچے کی فطرت کے مطابق ہونا چاہیے نہ کہ امتحانی سلیبس اس پر اپنا حکم جاری کرے۔

☆ تعلیمی عمل میں فیصلہ کن عنصر نئی سے نئی چیز سیکھنے کی جستجو کا ہوا کرتا ہے۔

☆ بچہ بڑے آدمی کا چھوٹا سائز یعنی اس کا Miniature نہیں ہے' نہ ہمیں اس کے ساتھ یہ سوچ کر سلوک کرنا چاہیے' جو بچے کی خوشی اور سیکھنے کے فطری جوش کو فنا کر دیتا ہے۔

☆ ہر بچہ ایک لاثانی فرد ہوتا ہے اور اسے ویسے ہی دیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔

☆ استاد کو اپنے اندر طلبا کے لیے محبت کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے' اسے ان کی انفرادی فطرت کا

احترام کرنا چاہیے' استاد کا ایک ہمدرد راہنما اور مشیر ہونے کے ساتھ اسے اپنے مضمون میں مہارت بھی ہونی چاہیے' استاد کو کسی بھی حالات میں طلبا پر اپنے خیالات نہیں ٹھونسنے چاہئیں۔

❖.....❖.....❖

پاسٹالوزی

PASTALOZZI (1746-1827)

پاسٹالوزی سوئیٹزرلینڈ کا رہنے والا ایک تعلیمی مصلح (Reformer) تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ تمام انسان اپنی فطری حالت میں برابر ہیں، لہٰذا وہ سب یکساں طور پر تعلیم کا استحقاق رکھتے ہیں۔ انسان سوسائٹی کا حصہ ہوتا ہے اور اس کی ذہنی حالت (State of Mind) تہذیبی مرحلے کا پتہ دے رہی ہوتی ہے، جس میں وہ رہ رہا ہوتا ہے، یعنی کسی انسان کی سوچ اور فکر سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ ایک قبائلی فیوڈل معاشرے کا رہنے والا ہے یا ترقی یافتہ صنعتی سوسائٹی کا۔

پاسٹالوزی پرامید تھا کہ انسان معاشرے میں موجود تضادات کے باوجود تعلیم کی قوت سے تہذیب کی اعلیٰ تر منزل اور اخلاقیات کی اعلیٰ تر سطح تک پہنچ جائے گا۔ اس کے مطابق تعلیم کا بنیادی اور آخری مقصد انسان اور معاشرے کے ارتقاء کو کامل بنانا ہے۔ اس کا کہنا تھا۔ ''تعلیم ایک باغبان کی مانند ہے جس کے سامنے ہزاروں درخت کھلتے اور نشوونما پاتے ہیں، وہ ان کی حقیقی نشوونما میں کوئی حصہ ادا نہیں کرتا..... وہ صرف پودوں کو اگاتا اور انھیں پانی دیتا ہے..... معلم (Educator) بھی یہی کرتا ہے، وہ زندہ رہنے کی کوئی قوت نہیں بخش رہا ہوتا، نہ جان عطا کرتا ہے، نہ سانس، وہ صرف ارتقاء و ترقی کے عمل کی دیکھ بھال کرتا ہے، جو اپنے قوانین کے تحت چل رہا ہوتا''۔

پاسٹالوزی کے نزدیک گھر کا ماحول بچے کی شخصیت کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہمدردی و محبت بخشنے والا اور قابل بھروسہ ماحول بچے کو خود اعتمادی، کھلی فکر و نظم، مثبت رویے اور دوسروں کے ساتھ صحت مندانہ تعلقات بنانے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ پاسٹالوزی نے زور دیا کہ خیالی تصورات کو ٹھوس اشکال میں لا کر پیش کرنا چاہیے اور ان کی مثالیں دینی چاہئیں، یعنی اگر جغرافیہ پڑھانا ہے تو طلبا کو باہر لے کر جانا ہوگا، گنتی سکھانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ کر اور اتر کر اسے جمع و تفریق کا آئیڈیا دینا چاہیے۔ پاسٹالوز تعلیم کو انسان میں پائی جانے والی مخفی صلاحیتوں اور قوتوں کو اجاگر کرنے کا ذریعہ سمجھتا تھا۔

❖.....❖.....❖

وہائٹ ہیڈ

Alfred White Head

وہائٹ ہیڈ ایک ممتاز فلاسفر، ریاضی دان اور ماہر طبیعیات تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان کے اندر ایک فطری ابھار (Impulse) یا خواہش ہے، اپنے کو بہتر بنانے اور ترقی دینے کی اور یہی فطری خواہش چیزوں سے پردہ ہٹانے اور سیکھنے کے عمل میں اس کی دلچسپی پیدا کرتی ہے۔ تعلیمی عمل اس طرح کا نہیں ہونا چاہیے، جیسے کسی صندوق میں چیزیں بند کی جارہی ہوں۔ ذہن کو کبھی بے مزاحمت اور غیر متحرک (Passive) نہیں ہونا چاہیے، وہ خیالات کو قبول کرتا ہے اور محرک (Stimulus) سے اثر پذیر ہوتا اور ردعمل دیتا ہے، چنانچہ تعلیم کا کام ذہن کی اس صلاحیت کو زیادہ سے زیادہ تیز کرنا ہے۔

وہائٹ ہیڈ لبرل اور فنی مضامین کے درمیان تضاد کو مغالطۂ دہی پر مبنی سمجھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کوئی ایسی مناسب فنی تعلیم نہیں ہوسکتی جو لبرل (عرف عام میں آرٹس کی تعلیم جو تہذیب نفس کے لیے دی جاتی ہے) نہ ہو، اور کوئی آرٹس کی تعلیم نہیں ہوسکتی جو ٹیکنیکل نہ ہو۔ تعلیم طالب علم کو ایسا بنادے کہ وہ کسی مخصوص علم کو اچھی طرح جانتا ہو اور وہ کسی مخصوص کام کو اچھی طرح کرسکتا ہو۔ اگر اس معیار پر ہم آج اپنے ڈگری یافتہ نوجوانوں کو دیکھیں.....تو بے حد مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ نہ وہ کسی مخصوص علم کو اچھی طرح جانتے ہوتے ہیں اور نہ وہ کام اچھی طرح کرسکنے کے قابل

ہوتے ہیں بظاہر جس کے لیے انھیں یونیورسٹی نے ڈگری عطا کی ہوتی ہے۔ہم ایک ناکام نظام تعلیم کو گھسیٹتے چلے جارہے ہیں' اس قوم کے مینجروں کو کوئی دلچسپی نہیں کہ اپنی قوم کے افراد کو اہلیت کار (Efficient) بنانا ہے' اگر قوم کے چند نوجوان کوئی قابل ذکر کارکردگی دے جاتے ہیں تو اس میں تعلیمی ماحول کا اپنا کوئی حصہ نہیں ہوتا وہ ان بے چارے طلبا کی اپنی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ساری رکاوٹوں اور مایوس کن حالات کو پار کر جاتے ہیں۔ وہائٹ ہیڈ نے سائنس اور آرٹس کے بیچ امتیاز اور تضاد کی جو بحث چھیڑی ہے وہ ہم ترقی پذیر قوموں کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے' جو کبھی ادھر اور ادھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔کبھی ہم نے نوآبادیاتی نظام کے زیر اثر دفتری بابو پیدا کرنے کے لیے آرٹس کے دھارے (Stream) پر زور دینے والے نظام تعلیم کو چلانا شروع کر دیا۔آرٹس پڑھانے کے پیچھے زندگی کا مقصد ایک اچھا انسان بننا ہے۔پس ماندہ قوم کی ہر حرکت پس ماندہ' غیر جامع اور ادھوری ہوتی ہے۔نتیجہ یہ نکلا کہ آرٹس مضامین کے پڑھے لکھے بے کار نوجوان بننے شروع ہو گے۔ ہر کوئی دفتر میں بیٹھنا اور افسری کرنا چاہتا تھا۔کوئی عملی کام کرنے کی صلاحیت سے وہ خالی تھا۔اب جب یہ دیکھا کہ یہ دنیا معاشیات کی ہے' ٹیکنولوجی اور سائنس کی ہے' اس کے بغیر ہر فرد اور قوم بے کار ہے تو پھر ہم نے سائنس پر زور دینا شروع کر دیا' ہر بچہ ''ڈاکٹر اور انجنیئر '' بننے کے خواب دیکھنے لگا..... سیلبس سے آرٹس کے کئی اہم مضامین غائب ہونے شروع ہو گئے' یا ان کی مارکیٹ ویلیو ختم ہو گئی۔آرٹس کے مضامین ''یتیم اور مسکین'' کہلائے جانے لگے۔آرٹس والے طلباء کو آج ہمارے اسکولوں میں نکمے اور کند ذہن فرض کر لیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ اسی طرح بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔تقسیم ہی اس بنیاد پر کر دی جاتی ہے۔ذہین اور لائق طلباء کو سائنس دے دی جاتی ہے اور مقابلے میں کم تر رہ جانے والے طلباء کو آرٹس کے مضامین دے دیئے جاتے ہیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر طلبا نکمے اور نالائق ہیں تو انھیں آرٹس کے مضامین بھی دینے کی کیا ضرورت ہے۔ہم تعلیم کے ساتھ ہی نہیں علم کے ساتھ بھی مذاق کر رہے ہیں۔کیا اس معاشرے کو نکمے اور کند ذہن قانون دان' ماہر معاشیات' ماہر

نفسیات، ماہرین سماجیات درکار ہیں؟ ظلم کی بات یہ ہے کہ آرٹس والے طلبا خود بھی احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں، چنانچہ وہ اپنا پیسہ، وقت اور زندگی سب ضائع کر دیتے ہیں۔ نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے تعلیمی نظام میں آرٹس اور سائنس کے درمیان اس تفریق کا خاتمہ کریں، ہمیں بہترین سائنس دان ہی نہیں بہترین لبرل سائنسوں کے ماہرین بھی چاہئیں۔ وہائٹ ہیڈ نے بڑا اہم سوال اٹھایا کہ دراصل دونوں میں کوئی فرق نہیں، روح اور جسم کو ایک دوسرے سے جدا کیسے کیا جاسکتا ہے، جسم روح کے بغیر بے کار اور روح جسم کے بغیر وجود ہی نہیں رکھتی۔

اسلام کی فکری اور عملی ارتقاء میں ایک کیفیتی تبدیلی (Qualitative Change) پیدا ہو رہی ہے۔ آرٹس اور سائنس دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو رہے ہیں، دونوں ایک دوسرے کی راہنمائی کر رہے ہیں، جدید فزکس فلسفے میں تبدیلی ہو رہی ہے۔ مشین بنانے کے لیے مشین استعمال کرنے والے کو سمجھنا بھی نہایت ضروری ہے، تاریخ ہو یا جغرافیہ، علم جمالیات ہو یا علم سماجیات سب علوم مادر سائنس کے ماتحت ترقی پذیر ہیں۔ سائنس صرف ٹیکنالوجی کو ہی نہیں لبرل اور آرٹس کے میدانوں کو بھی متاثر کر رہی ہے، ان کے اندر بھی ٹیکنالوجی پیدا کر رہی ہے۔ آج فلسفہ و سماجیات کے مسائل کے حل کے لیے کمپیوٹر شریک کار ہو چکا ہے، وہ زمانہ گیا جب علمی اور فکری کاوش کی بنیاد صرف نظری اور خیال آرائی (Speculation) پر رکھی جاتی تھی۔ آج ہر جگہ آپ کو ٹھوس اور مادی حقائق سامنے رکھنے پڑتے ہیں۔ مشین ہر علم کا حصہ بن چکی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہائٹ ہیڈ نے آرٹس اور فنی تعلیم کے درمیان کسی تضاد کو ماننے سے انکار کر دیا۔

وہائٹ ہیڈ جمالیاتی تعلیم کو خصوصی مقام دینے کا حامی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ تعلیم اگر خیالات میں حسن اور آپ کی شخصیت میں ذوق اسٹائل (A Taste for Style) پیدا نہیں کرتی تو وہ بے کار ہے۔ خواہ آپ ادب پڑھ رہے ہوں یا سائنس، یا فنی مضامین، آپ کی نظر و فکر اور شخصیت میں ایک الگ اسٹائل ہونا چاہیے اپنے عمدہ ترین معنی میں یہ اسٹائل ہی ہے جو کسی تعلیم یافتہ ذہن کا آخری حاصل ہوتا ہے۔ یہی صفت مفید ترین بھی ہے۔ ایک صاحب اسٹائل منتظم

وسائل کے ضائع ہونے سے نفرت کرے گا' اسٹائل کا فہم رکھنے والا انجینئر میٹریل کو بچت کے ساتھ استعمال کرے گا' اسی طرح ایک دستکار حسِ اسٹائل کی وجہ سے بہتر کام کرے گا۔ وہائٹ ہیڈ اس سلسلے میں ایک بڑا خوبصورت جملہ ترتیب دیتا ہے۔

"Style is the Ultimate Morality of Mind"

اسٹائل ذہن کی پاکیزگی کی انتہا ہے۔

وہائٹ ہیڈ ایسے اساتذہ کے رویے اور طریقوں کی مذمت کرتا ہے جو بچے کی سیکھنے کی فطری خواہش کو کچل دیتے ہیں' وہائٹ ہیڈ سیکھنے اور پڑھنے کے تین مرحلوں کا ذکر کرتا ہے۔

* رومانی مرحلہ The Stage of Romance

اس اسٹیج پر بچے میں جاننے کا تجسس ہوتا ہے' اسے چیزوں کا پتہ لگانے اور انہیں سمجھنے کا جوش ہوتا ہے' اس مرحلے پر مضمون کو ایک وسیع تر عمومیت (Broad Generalities) میں پیش کرنا چاہیے' تاکہ بچے کی دلچسپی کو بروئے کار لاکر اس کے اندر کے رجحانات کو ابھارا جا سکے..... جو بھی مضمون پڑھایا جائے وہ صرف سطحی باتوں تک محدود رہنا چاہیے تاکہ بچے کی خوشی برقرار رہے اور اسے مضمون کی افادیت کے بارے میں بھی پتہ چل جائے۔

* صحت مضمون کا مرحلہ Stage of Precision

یہ وہ مرحلہ ہے جب مضمون کو اپنی تمام جزیات' موزونیت اور صحت کے ساتھ پڑھانا چاہیے' تاکہ طالب علم حقائق کا تفصیلی تجزیہ کرنے کے قابل ہو سکے۔

* عبور کا مرحلہ Stage of Mastery of Subject

جو علم حاصل کیا جا چکا ہے اب اسے متنوع حالات میں اس کا اطلاق سیکھنا ہے۔

وہائٹ ہیڈ استاد کے رول کے بارے میں چند اصول پیش کرتا ہے جن کے مطابق استاد کا پہلا کام ہے بچے کی دلچسپی کو ابھارنا' اسے قائم رکھنا اور اسے نئی سطحوں تک لے کر جانا۔ استاد کا دوسرا کام بچے کی نفسیات کو سمجھنا ہے' تیسرے استاد کا صرف ''بیج کو پانی'' دینا نہیں ہے' بلکہ بیج میں صلاحیت پیدا کرنا ہے' کہ وہ خود پڑھنے والا (Self Learner) بن جائے۔

وہائٹ ہیڈ استاد کو مشورہ دیتا ہے کہ ''آرٹ بڑا ہے اور زندگی چھوٹی' بہت زیادہ مضامین مت پڑھاؤ لیکن جو کچھ پڑھاؤ اسے بھرپور پڑھاؤ''۔

وہائٹ ہیڈ نے بیسویں صدی کے ابتدا میں اس امتحانی طریقہ کار پر تنقید کی' جو ہمارے ہاں ابھی تک رائج ہے' جس میں ایک خارجی اور سخت Rigid مشینری ہر اسکول کے بچے کا ٹیسٹ لیتی ہے۔ جس میں ہر اسکول مجبور ہے کہ وہ بچے کو ایک متعین امتحان کے لیے تیار کرے' ایک ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل کے پاس کوئی موقع نہیں کہ وہ طلبا کی اسکول کے مواقع اور مقامی حالات کے مطابق تربیت کر سکے۔ اس کا مشورہ تھا کہ ہر اسکول کو اپنا اپنا اسکول چھوڑنے کا سرٹیفکیٹ دینے کا حق ہونا چاہیے۔ ہمارے طریقہ امتحان میں ایک وسیع تر لچک اور ٹیسٹ کے مختلف النوع طریقہ کار رائج کرنے کی ضرورت ہے۔ سارے کے سارے امتحان کو صرف تحریری (Written Based) نہیں ہونا چاہیے۔ طالب علم کا امتحان اس کی سال بھر کی کارکردگی کے مشاہدے پر استوار ہونا چاہیے نہ کہ صرف چند گھنٹوں کے دوران لکھی گئی بیانیہ تحریروں (Statements) سے۔

وہائٹ ہیڈ کا کہنا تھا کہ تعلیم' فرد ہو یا قوم' اس کے اندر احساس فخر اور خود اعتمادی پیدا کرتی ہے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی ماضی کی کیا کامرانیاں رہی ہیں اور مستقبل میں ترقی کے لیے آپ کی کیا خواہشات ہیں۔ اس سے بہرحال ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ 80 فی صد آبادی کو ناخواندہ رکھ کر کس منہ سے اپنے کو ایک قابل فخر اور خود اعتماد قوم قرار دے سکتے ہیں۔ دس کروڑ سے زائد آبادی کی تعلیم سے محرومی ہمارے لیے ایک شرمناک فعل ہے۔

کیا ہم تیزی سے ترقی کرتی دنیا کے سامنے سر اٹھانے کے لائق ہیں؟ کیا ہماری نسلیں

روشن مستقبل کی امید کرسکتی ہیں؟ ایک ناخواندہ اوران پڑھ قوم کوکوئی حق حاصل نہیں کہ وہ خود کو باوقار خیال کرے۔ وہائٹ ہیڈ نے کہا تھا ''فقط اس وقت جب ہم پر یہ بات صاف ہوجائے کہ ہم کس طرح کی سوسائٹی تعمیر کرنے کی کوشش کررہے ہیں' اپنی تعلیم کی خدمات کواپنے منتہا ومقصود کے مطابق ڈیزائن کرسکتے ہیں''۔ وہائٹ ہیڈ نے ہماری قوم کے لیے بہت اہم سوال کھڑا کردیا ہے۔ کیا ہم اپنے مستقبل کے بارے میں واضح ہیں؟ کیا ہم پر واضح ہے کہ ہم کس طرح کی سوسائٹی تعمیر کرنا چاہتے ہیں؟ اگر یہ واضح ہے تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ تعلیم اور تعلیمی نظام سے بدترین قسم کی ہماری قومی غفلت کا کیا مطلب ہے۔ کسی قوم کا تعلیمی نظام ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں اس قوم کا چہرہ بھی نظر آتا ہے اوراس کی قسمت بھی.....ایک بدحال اجڑا اور غفلت زدہ تعلیمی نظام..... ہماری آج کی قومی صورت بھی بتارہا ہے اور کل کی قسمت کا حال بھی دکھارہا ہے.....حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔

❖.....❖.....❖

جان ڈیوی

John Dewy (1859-1952)

اب ہم اس شخص تک پہنچ گئے ہیں جو نہ صرف بیسویں صدی کے تعلیمی نظریے پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا بلکہ امریکہ کو وہ فلسفہ تعلیم دیا جس سے امریکہ دنیا کی تنہا طاقت ور ترین قوم میں ڈھل گیا' ہر مصلح وقت کی پیداوار ہوتا ہے' بیسویں صدی سائنس اور ٹیکنالوجی سے معنون تھی۔ انسان مابعد الطبیعیات کی دھند سے نکل کر مادی فوائد اور ہر کام کے عملی استفادے کو ڈھونڈنے چل نکلا۔ اب نظریات کو بھی زر نقد (Cash Value of Ideas) کے ترازو میں تولا جانے لگا۔ آزاد معیشت' پرائیویٹ معیشت اور جمہویت کی باتیں ہونے لگیں' ایک ایسا جمہوری عمل جس میں سوسائٹی کے سب افراد سرگرمی سے شریک ہو سکیں۔ چنانچہ کہا گیا کہ تعلیم کا منتہائے مقصود ذہانت کی نشوونما اور ترقی ہونا چاہیے۔

جان ڈیوی اور دوسرے عملیت پسندوں (Pragmatists) نے مابعد الطبیعیات (Meta Physics) میں کسی دلچسپی سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا حیات و کائنات کا ''جوہر'' یا کسی ''بنیادی اور ابدی حقیقت'' کی تلاش کرتے پھرنا ایک فضول فرصت کا مشغلہ ہے۔ انسان تجربے سے تخلیق پانے والا جسم حیوانی (Oraganism) رکھے بغیر وجود ہی نہیں رکھ سکتا۔ اسی تفاعل باہمی سے انسان ایک سادہ خلیے سے ترقی کر کے ایک انتہائی پیچیدہ ساخت میں تبدیل

ہوگیا۔انسان ایک نشو ونما پانے والا' آگے بڑھنے والا جاندار ہے' جس کی کچھ آزوئیں' خواہشات' ضرورتیں اور دلچسپیاں ہوتی ہیں' جو اس کی جدوجہد' مقاصد اور منزلوں کو متعین کرتی ہیں' تاکہ وہ اپنی ذہانت کا استعمال کر کے انھیں حاصل کر سکے علم اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ انسان کا تجربہ ہے جو انسانی تجربے سے باہر ہے وہ علم نہیں ہے۔ ماحول کے ساتھ سرگرم باہمی ربط سے وہ کچھ تجربہ حاصل کرتا ہے' مسئلہ کو قابو کرنے اور حل کرنے کی سوچتا ہے' جو ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔اس سے ذہانت درجہ بدرجہ آگے بڑھتی ہے۔ ذہانت کوئی تجریدی (Abstract) چیز نہیں' جو ہماری کھوپڑی کے اندر بیٹھی ہوئی ہے' یہ تو صرف سوچنے کی خاصیت (Quality of Thinking) کا نام ہے' جس کا مقصد زندگی کے مسائل کو موثر طریقے سے حل کرنا ہے۔ ہم اس وقت ذہین کہلائے جانے کے قابل ہو سکتے ہیں جب ہم مسائل کو سائنسی طریقے سے حل کر پائیں۔مسئلہ کب پیدا ہوتا ہے جب ہم کوئی کام کرتے ہیں اور اس دوران ہمیں کسی رکاوٹ یا خلل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی رکاوٹ اور خلل نفسیاتی ہیجان اور تحریک (Stimulation) پیدا کرتی ہے تاکہ ہم سوچیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہمیں کوئی مسئلہ درپیش نہ ہو تو ہم سوچیں بھی نہیں۔ ہم سوچتے ہیں تو ہمیں مسائل کے کچھ حل سجھائی دیتے ہیں۔ اس عمل کو مفروضوں کی تشکیل (Formation of Hypotheses) کہتے ہیں۔ پھر ہم ان مجوزہ مختلف حلوں کے نتائج پر غور کرتے ہیں اور پھر ہم ان منتخب حلوں (Options) کو آزمانا شروع کر دیتے ہیں' حتیٰ کہ صحیح حل تک پہنچ جاتے ہیں۔

سچ کیا ہے' صداقت اس طرح کی خاصیت کا نام نہیں جو خارجی شے کے اندر چھپی ہوتی ہے اور منکشف ہونے کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔صداقت ایک خیال اور آئیڈیا ہوتا ہے' جسے آزمایا جا چکا ہوتا ہے۔تصدیق کی جا چکی ہوتی ہے اور مسائل کے حل میں اسے موثر پایا گیا ہوتا ہے لہٰذا وہی آئیڈیا سچ ہے' اگر وہ کام آتا ہے یا کام (Work) کرتا ہے اور وہ مفید بھی ہے صداقت نہ تو کسی قطعیت کا نام ہے اور نہ ہی یہ ''آسمانوں'' سے اتری ہوتی ہے۔صداقت انسان کی بنائی چیز

ہے۔الہیات اس کا ماخذ نہیں۔مستقبل میں کوئی اور شہادت ملنے پر ''صداقت'' کی تصحیح کی جاسکتی ہے۔

کائنات میں اٹل اور حرف آخر صداقتوں کا کوئی وجود نہیں' سائنس کی سچائیاں قابل ترمیم اور عارضی نوعیت کی ہوسکتی ہیں۔ ہر طرح کے زمان و مکاں کے لیے یکساں سچائی کام نہیں کرتی۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جان ڈیوی قوم کو خیالی اور ساکت پذیر فلسفوں سے نکال کر انھیں میدان عمل میں صداقتوں کی تلاش کی دعوت دے رہا ہے۔اگر ہم پس ماندہ اقوام کے حوالے سے بات کریں جو سیاسی غلامی' قرضوں' افلاس اور ناخواندگی میں جکڑی ہیں' ان سب کو یہ گمان ہے کہ دنیا کی سب سے زیادہ سچائیاں ان کے پاس ہیں اور آخر میں کہیں گے ''بس! عمل نہیں ہو رہا''۔ عجیب بات ہے آپ صدیوں سے بحرانوں' مسائل اور زوال کا شکار ہیں تو ان سچائیوں کا استعمال کیوں نہیں کرتے .....وہ سچائیاں کس مرض کی دوا ہیں' انہیں گلے لگا کر کیوں رکھا ہے.....حقیقت یہ ہے کہ وہ سچائیاں' سچائیاں ہی نہیں ہیں' جو عمل پیرا نہ ہوں' عمل اور سچائی الگ الگ نہیں ہوتے.....سچائیاں عمل میں اور عمل کے ساتھ ابھرتی ہیں.....''سب سے زیادہ سچے عقائد' سماجی و اخلاقی نظریات'' ان غیر تعلیم یافتہ اور بھکاری قوموں کے پاس ہیں جن کا تاریخ انسانی میں کوئی کردار ہی نہیں ہے۔ترقی یافتہ قومیں چاہیں تو یہ زندہ رہیں ورنہ یہ زندہ بھی نہ رہیں۔اگر یہ کہا جائے کہ یہ قومیں خدا پرست ہیں تو یہ بھی بہت بڑا جھوٹ نظر آتا ہے کہ ان قوموں کے اندر انفرادی' گروہی' طبقاتی اور فرقہ وارانہ سطح پر وہ ننگے ظلم اور کراہت انگیز زیادتیاں ملتی ہیں کہ بڑے سے بڑا ملحد بھی پناہ مانگ لے.....اور اگر یہ کہا جائے کہ ہم بڑی اخلاق پسند قومیں ہیں تو جتنی ریاکاری اور دوہرا معیار ہمارے ہاں پایا جاتا ہے' اس سے بڑے سے بڑا مخرب اخلاق بھی اپنا دامن بچانے کو دوڑے.....خرابی کہاں ہے؟ ہمیں خیالستاں سے باہر نکلنا پڑے گا' ہمیں اپنے پیارے مفروضوں کو چھوڑنا ہوگا.....اور جان ڈیوی جیسے دانش وروں کی بات کو ماننا ہوگا کہ جو نظریہ ''ورک'' نہیں کرتا وہ بے کار ہے۔ہمیں فطرت کے ساتھ تفاعل باہمی کر کے عملی اور مفید صداقتوں

کی تلاش از سر نو کرنی ہوگی۔ صداقتیں عمل سے پرے اور جداو جود نہیں رکھتیں۔

جان ڈیوی اب ''اقدار'' کی بحث چھیڑتا ہے۔ ''اقدار'' کیا ہیں؟ ''قدر'' سے مراد وہ چیزیں اور رویے ہوتے ہیں' جسے انسان عزیز رکھتا ہے' چاہتا ہے' خواہش رکھتا ہے یا اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ ''اقدار'' بھی کسی چیز کے اندر خارج سے ثبت کردہ خاصیتیں نہیں ہوتیں اور نہ ہی الوہی اصلیت (Divine Origin) کی حامل ہوتی ہیں' بلکہ ان کا مرکز انسان خود ہی ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کوئی ایک شخص یا گروہ جب کسی چیز کو مرغوب جانتا ہے تو اس کی قدر اس فرد اور گروہ کے چاہنے تک محدود ہوتی ہے۔ لیکن قدر کی یہ تعریف اطمینان بخش نہیں ہے کیونکہ ایک شخص جس چیز کی خواہش کر رہا ہے..... عین ممکن ہے وہ اس کے لیے اچھی نہ ہو۔ ایک شخص کو شدید بخار ہے وہ ٹھنڈا پانی پینا چاہتا ہے یا دھوپ میں کھڑا ہونا چاہتا ہے ہوسکتا ہے ایسا کرنا اس کے لیے خطرناک ہو یا اس کے لیے غلط مشورہ ہو۔ چنانچہ ''قدر'' کے لیے یہ سوال ضروری ہے کہ ان ''اقدار'' کو اپنانے کے جو نتائج ہیں کیا وہ اس شخص کے دوررس مفادات کو پورا کرتے ہیں۔ اس لیے کوئی قوم جن اقدار کو عزیز سمجھ رہی ہے یہ دیکھنا ضروری ہے کیا وہ ''اقدار'' اس قوم کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تو نہیں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ تعلیم تجربے کے نتیجے میں آتی ہے لیکن ضروری نہیں ہر تجربہ تعلیمی خاصیت (Educative) رکھتا ہو۔ تعلیمی تجربہ وہ ہوتا ہے جو بارآور اور پیداواری (Productive) ہو اور مستقبل میں دوسرے تجربوں کی راہ کھولتا ہو۔ وہ تجربہ محدود ہوتا ہے جو دوسرے ممکنہ تجربوں کو روکے۔ مثلاً سزائے موت تجربہ ہے لیکن اس کے بعد سب تجربے ختم ہو جاتے ہیں' چنانچہ جان ڈیوی تعلیم کی تعریف یوں کرتا ہے۔

> ''تجربے کی مسلسل تعمیر نو یا تنظیم نو جو تجربے کے معنوں میں اضافہ کرتی رہے اور جو مستقبل کے تجربات کی طرف لے جانے کی صلاحیت میں اضافہ کرے''۔

لہٰذا تعلیم کا مقصد طالب علموں کی اس صلاحیت کو ترقی دینا ہے جو مستقبل کے مسائل کا تدبر سے سامنا کر سکے.....یعنی ذہانت کو ترقی دینا ہے۔ اس تعریف کی روشنی میں اگر ہم اپنے پورے تعلیمی ڈھانچے کا مطالعہ کریں کہ کیا وہ اس معیار پر پورا اترتا ہے کیا وہ ہمارے نوجوانوں کی صلاحیت میں اضافہ کرتا ہے کہ وہ پرانے تجربوں میں نئے معنی پیدا کرے اور خود کو نئے تجربات میں ملوث کرے؟ معاملہ اس کے برعکس ہے' ہمارا تعلیمی نصاب مرتب کرنے والوں اور اس نصاب کو بچوں تک پہنچانے والے اساتذہ کی اکثریت اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہ ہونے پائے' وہ نہ نئے سوال سوچے اور نہ موجود سوالوں کے نئے جواب تلاش کرے.....ہمارے تعلیمی ڈھانچے کے مطابق مذکورہ سوال بھی آخری ہیں اور ان کے جواب بھی کسی ردوبدل کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ معاشرے میں قیامت برپا ہو جائے گی.....ملک خطرے میں پڑ جائے گا' ایمان سلامت رہے گا نہ اخلاق.....اگر آپ نے کچھ نئے سوال پیدا کر دیئے یا سوالوں کے جواب کے لیے ادھر ادھر دیکھا.....حد تو یہ ہے کہ ٹیچر اپنے لکھوائے ہوئے مضمون میں ردوبدل کی بھی اجازت نہیں دیتا.....لیکن جان ڈیوی کچھ اور ہی کہتا ہے اس کے مطابق تعلیم کا مقصد ذہانت کو ترقی دینا ہے اور اس ترقی کی کوئی حد نہیں ہے' انسان ذہانت جتنے مختلف النوع اور پیچیدہ مسائل میں پڑے گی اتنی ہی ذہانت میں اضافہ ہوگا' چنانچہ تعلیم ''نشوونما'' اور صرف ''نشوونما'' کے سوا کچھ نہیں.....

ڈیوی ہماری اس روایتی سوچ پر تنقید کرتا ہے جو ہماری تعلیم کے پس منظر میں نظر آتی ہے کہ ہم بچے میں بہت جلد اتنا کچھ بھر دینا چاہتے ہیں کہ وہ جلد بڑا ہو کر بالغ بن جائے یا اس کی سوچ جلد از جلد بالغوں کی طرح ہو جائے.....ذرا اپنے ابتدائی اور ایلیمینٹری اسکولوں کی سطح کا نصاب ملاحظہ فرمائیں' ہم معصوم چھوٹے سے بچوں کو کیا کیا پڑھا رہے ہوتے ہیں.....انھیں مذہبی' مابعد الطبیعیاتی مسائل' اخلاقیات کے بارے میں قوم اور ملک کے نظریاتی اور سیاسی مسائل پڑھا رہے ہیں' ان کو بتا رہے ہوتے ہیں کہ کون کون کافر ہے اور کون ہمارا دشمن.....ساتھ ہی خواہش

ہوتی ہے کہ بچہ ساری کی ساری آسمانی کتاب بھی حفظ کر لے.....دین و مذہب کا عملی اور نظری ''ماہر'' بن جائے۔

مدرسے کی چار دیواری کے اندر ہی نہیں گھروں میں بھی ماں باپ کا رویہ یہی ہوتا ہے۔ بچیوں کے وہ حلیے بنا دیئے جاتے ہیں کہ وہ چھوٹی امائیں لگنے لگتی ہیں۔ بالغ اور بوڑھے افراد کی ساری چال ڈھال' طرز لباس سارے عقائد اور اخلاقی سبق بچپن میں ہی ڈھونس دیئے جاتے ہیں۔ ہمارے روایتی نظام تعلیم میں بقول جان ڈیوی' ''تعلیم مستقبل کی بالغ زندگی کی تیاری بن جاتی ہے۔ بچے کو بڑوں کے ہنر سے لیس کر دیا جاتا ہے۔ بچے کو ایک طرح سے پرامیسری نوٹ (جس میں حامل کو درج رقم کسی مستقبل کی تاریخ پر ادا کرنے کا وعدہ ہوتا ہے) پکڑا دیئے جاتے ہیں جن کی قیمت بڑا ہو کر وہ حاصل کر لے گا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ شاید نقدی وصول کرنے تک زندہ نہ رہے'' کیوں کے وقت ہی بدل جائے گا۔ بچپن میں اس کے ہاتھ پکڑائے گئے پرامیسری نوٹ کسی کام نہ آئیں گے' چنانچہ ہم اس کا بچپن بھی چھین لیتے ہیں اور اس کا مستقبل بھی برباد کر ڈالتے ہیں۔ بچپن میں وہ چیزیں سیکھائی جاتی ہیں جو بڑوں کے کام ہیں یا وہ بڑا ہو کر کیا کرے گا۔ بچہ اپنے سامنے کی دنیا کو سیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے' ہم اس کی وہ خوشی چھین لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ مسائل جو اس کے سامنے ہوتے ہیں ان کا مقابلہ کرنے کی مہارت سے محروم رہ جاتا ہے۔

اب جان ڈیوی نصاب اور اسکول کی تنظیم پر ان الفاظ میں حملہ آور ہوتا ہے۔ ''ہر بچے کو ایک جیسا نصاب پکڑا دیا جاتا ہے خواہ اس کی دلچسپی اور قابلیت کچھ بھی ہو۔ سب کو اکٹھے بٹھا کر پڑھانا شروع کر دیا جاتا ہے' جیسے وہ سب ایک طرح کا ہی نصاب چاہتے ہیں یا ان کے سیکھنے کی رفتار ایک جیسی ہے' مزید برآں ان کو مردہ معلومات کی خوراک دینی شروع کر دی جاتی ہے جن کا ان کی زندگیوں کے تجربات سے دور تک واسطہ نہیں ہوتا لیکن طلبا بے چارے انھیں ہضم کرنے اور رٹہ لگانے پر مجبور ہوتے ہیں' ان مردہ معلومات کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں مضامین (Disciplines) کے نام سے پڑھایا جاتا ہے۔ ان مضامین کا زندگی کا ساتھ تعلق بچے کی سمجھ

بوجھ سے باہر ہوتا ہے' وہ ایک غیر متعلقہ مضمون سے دوسرے غیر متعلقہ مضمون کی طرف دھکیلا جاتا ہے اور اس کی سوچ مدرسے کی گھنٹی کی آواز پر دینیات سے ریاضیات کو منتقل ہوتی رہتی ہے۔' دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس طرح کے اسکولوں میں طلباء کو ''علم'' ایسے پڑھایا جاتا ہے جیسے وہ دوسروں کے تجربات کی تکمیل شدہ شے (Finished Product) ہوتا ہے۔ انھیں یہ بات محسوس کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ اپنے تجربات کی پراسیسنگ کر کے خود بھی علم پیدا کر سکتے ہیں۔ پھر طریقہ تعلیم اس طرح کا ہوتا ہے جو طلبا کے لیے باعث تحریک ہی نہیں ہوتا' طریقہ تدریس اور نصاب تعلیم اتنا بور ہوتا ہے کہ طلبا میں علم سیکھنے کا کوئی جذبہ ہی پیدا نہیں ہوتا وہ تو صرف ''امتحان'' دینے یا استاد اور والدین کے خوف سے پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ان کا کوئی ذہنی' فکری یا روحانی رشتہ پیدا ہی نہیں ہو پاتا۔ کیا ہم توقع کر سکتے ہیں کہ اس طرح کے ''علم'' اور اس علم کے ساتھ اس طرح کے ''رشتے'' سے ہمارے نوجوان کل کو کوئی علم پیدا کر پائیں گے۔ یہی وجہ ہے ایسا علم ہمارے ''پڑھے لکھوں'' کا کچھ نہیں بگاڑ پاتا۔ ان کی ذہنی اور فکری سطح وہیں رہتی ہے جہاں ایک ناخواندہ شخص کی ہوتی ہے۔ ایسے اسکولوں میں استاد خود رٹا لگا کر آیا ہوتا ہے وہ لیکچر کے دوران طلباء سے مخاطب نہیں بلکہ ان پر سبق انڈیل رہا ہوتا ہے۔

چونکہ طلباء کے سامنے استاد خود کو بارعب اور اونچی شخصیت کے طور پر پیش کرتا ہے' لہٰذا ان کے پاس بے سدھ سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ وہ استاد کے بیان کردہ حقائق کو ایسے قبول کر رہے ہوتے ہیں جس سے اسفنج' پانی کو جذب کرتا ہے! جب کہ استاد کے لیے اہم بات یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے مضمون کو اس طرح پیش کرے جس سے بچے کی دلچسپی اور قابلیت میں اضافہ ہو اور اسے پتہ چلے کہ متعلقہ مضمون کے ساتھ اس کی زندگی اور کمیونٹی کا کیا تعلق ہے۔ ہمیں تو وہ مضمون بھی پڑھائے جاتے ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد ساری زندگی ان کا عملی تعلق سمجھ میں نہیں آتا۔ ہوسکتا ہے ان کے پڑھانے کے پیچھے بھی کوئی مقصد ہوتا ہو لیکن کبھی کوئی طالب علم کو بتانے کی تکلیف ہی نہیں کرتا۔ طالب علم بھی ان اضافی مضامین کو بوجھل طریقے سے یاد کرتا ہے اور

امتحان میں پھینک رہے ہوتے ہیں' کہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ بچہ بڑا ہوکر خود ہی تعلق سمجھتا رہے گا۔ ظاہر ہے اس طرح کی تعلیم ایک سماج دشمن رویہ اور مزاج پیدا کرے گی۔ کیونکہ بچے کو الگ تھلگ ہوکر پڑھنے اور اپنی انفرادی کوششوں سے نتائج حاصل کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ جان ڈیوی نے ہمارے نظام تعلیم کی ایک بہت بڑی نقصان دہ خامی کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ یہ ایک عام مشاہدے کی بات ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ جب کسی مقام کو حاصل کر لیتے ہیں ڈاکٹر' انجینئر یا آفیسر وغیرہ بن جاتے ہیں تو ان کا رویہ سوسائٹی سے مخاصمانہ ہوجاتا ہے۔ انھیں عام آدمی کے مسائل' سماج اور ملک کے مفادات سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ ان کے سامنے سوائے اپنی ذات اور مفاد کے کچھ نہیں ہوتا۔ جان ڈیوی کے مطابق یہ رویہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف اپنی ذاتی اور انفرادی محنت کی بنا پر ہی کامیابی حاصل کی ہوتی ہے' ہمارا طریقہ تدریس ایسا نہیں جس میں گروپ یا باہمی تعاون سے طلبا کامیابی کی طرف بڑھیں..... ہر طالب علم کی صرف اپنی ذاتی کوشش ہوتی ہے جس سے وہ کامیابی کی طرف بڑھیں..... ہر طالب علم کی صرف اپنی ذاتی کوشش ہوتی ہے جس سے وہ کامیابی تک پہنچتا ہے' حتیٰ کہ کامیابی میں اساتذہ کا بھی کوئی خصوصی تعاون نہیں ہوتا..... انھوں نے ایک نہایت اعلیٰ نتیجہ دکھانے والے طالب علم پر بھی اتنی ہی توجہ دی ہوتی ہے جتنی ایک فیل ہونے والے پر..... استاد صاحبان بس اپنی ''نوکری'' پوری کر رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص اپنی ذاتی کوششوں کی بنا پر کامیابی پانے کے بعد خود کو معاشرے کا شکر گزار محسوس نہیں کرتا اور اگر وہ معاشرے کے بارے کوئی احساس ممنونیت نہیں رکھتا تو پھر وہ اپنے مفاد پر سماج کے مفاد کو ترجیح بھی کیوں دے گا..... ہم تعلیم یافتہ طبقے کو کوئی الزام نہیں دے سکتے' ہمارا نظام تعلیم ہی ایسا ہے کہ اس سے خودغرض پڑھے لکھے لوگ ہی پیدا ہوسکتے ہیں۔ ایک بار جب کسی ڈاکٹر سے استفسار کیا گیا کہ عمومی طور پر بڑے اسپیشلسٹ ڈاکٹر اپنے رویے اور بھاری بھرکم فیسیں چارج کرنے میں اتنے سخت دل کیوں ہوجاتے ہیں' جواب تھا یہ لوگ بڑی تکلیفوں اور مصائب (اقتصادی' تعلیمی اور امتحانی نوعیت کے) سے گزر کر اس مقام پر پہنچتے ہیں'

اس دوران ان کی اناؤں کو کئی بار سسٹم نے ٹھیس پہنچائی ہوتی ہے، چنانچہ جب وہ کامیابی کے مقام تک پہنچتے ہیں تو ان کے اندر اینٹی سوشل رویہ پیدا ہوجاتا ہے۔ بیوروکریسی ہو یا ٹیکنوکریسی اس میں عوامی خدمت کا جذبہ اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک ہمارے نظام تعلیم میں سوشیالوجی اور اجتماعیت کا عنصر غائب ہے۔ اگر ایک نوجوان نے صرف ذاتی کوششوں سے سر دھڑ کی بازی لگا کر کوئی مقام حاصل کیا ہے تو وہ اپنا ''نوکر'' ہی ہوگا، عوام کا نہیں..... کیا اساتذہ، سسٹم اور معاشرے کو اس نوجوان کی ناکامی یا کامیابی کی کوئی پرواہ تھی؟

کیا معاشرہ فرد کے لیے پریشان ہے کہ فرد معاشرے کے لیے پریشان ہو!.....

جان ڈیوی اس سلسلے میں مشورہ دیتا ہے کہ اسکول کو گھر کی توسیع (Extension) ہونا چاہیے، تاکہ بچے کے گھر اور اسکول کے تجربے میں تسلسل اور ربط قائم رہے۔ اسکول بنیادی طور پر سماجی ادارہ ہے اور تعلیم ایک سماجی عمل۔ اسکول نہ صرف کمیونٹی کا حصہ ہے بلکہ بذات خود کمیونٹی، جہاں بچہ حیات اجتماعیہ اور باہمی تعاون کے تجربے سے گزرتا ہے۔ اسکول براہ راست معاشرے کو نہیں بدل سکتا لیکن وہ اس کی اصلاح یوں کرسکتا ہے کہ بچے کے اندر سماجی ذہانت (Social Intellect) پیدا کرے۔ تعلیمی نصاب میں وہ نفسیاتی عنصر شامل ہونا چاہیے جو بچے کی دلچسپیوں، مسائل اور ضرورتوں کا خیال رکھے..... بچے کی ضروریات صرف وہی نہیں ہوتیں جن کو وہ اپنی ضرورتیں محسوس کرتا ہے، بلکہ اس کی ان ضرورتوں کو بھی مدنظر رکھنا ہے، جب وہ معاشرے کے شریک رکن Participating Member کی حیثیت اختیار کرے گا تاکہ وہ سوسائٹی کی ہم آہنگی اور مفاد عامہ کو فروغ دے سکے۔ یہ تعلیم کی سماجی جہت ہے اور ان مطلوبہ مقاصد کو کن شکلوں اور ترتیب میں پیش کرنا ہے وہ تعلیم کی منطقی جہت ہے۔ سب سے زیادہ نظر عنایت سائنسی علوم کو ملنی چاہیے لیکن انھیں اس طرح نہ پڑھایا جائے کہ فزکس یا کیمسٹری کی تھیوریاں اور قوانین سیکھنے ہیں بلکہ اس طرح جیسے بچہ ان تھیوریوں اور قوانین کی تحقیق اور جستجو میں خود شریک ہے اور مزید علم کی دریافت میں یہ تھیوریاں اور قوانین اس کی مدد کررہے ہیں۔ سماجی

علوم بھی بہت اہم ہیں' تاریخ کا ذکر بادشاہوں کے قصوں سے نہیں انسان کی سماجی زندگی کے ریکارڈ اور ترقی کے حوالے سے ہونا چاہیے۔ اسی طرح زبان کا مطلب اطلاع دہی Communication ہونا چاہیے۔نصاب میں آرٹ' ڈرامہ' ادب اور موسیقی کو شامل ہونا چاہیے تاکہ بچے کی تخلیقی اور تصوراتی صلاحیتیں ابھر سکیں۔لیکن اہم ترین بات یہ ہے کہ سب مضمون اس طرح پڑھائے جائیں جیسے بچے کے اپنے مسائل حل کرنے میں مدد دی جارہی ہے نہ کہ جیسے اس میں معلومات کو اسٹور کیا جارہا ہے تاکہ بوقت ضرورت اس سے وہ معلومات اگلوائی جاسکیں۔ تدریس کے مذکورہ طریقے سے اپنے ہاں کا مقابلہ کریں تو یہی نظر یہ آئے گا کہ ہم ابھی تک پانچ چھ سو سال پہلے کے زمانے میں رہ رہے ہیں' ہمارے طریقہ تدریس میں ٹیچر کا کام طلباء کو کچھ طے شدہ معلومات اسٹور کروانا ہوتا ہے..... اور طلبا بھی اسے ''اسٹور'' ہی کر رہے ہوتے ہیں.....امتحان تک کے لیے..... یا بعد میں ان معلومات کا کچھ حصہ عملی زندگی میں کام آجاتا ہے' لیکن پڑھنے اور پڑھانے کے دوران جستجوئے علم سے علم اور تخلیق علم کا عنصر قطعی غائب ہوتا ہے۔ جو تعلیم کا حقیقی مقصد ہے۔

جان ڈیوی کہتا ہے مضمون کوئی بھی ہو اہم ترین چیز پڑھانے کا طریقہ ہے۔ پڑھانے کا پہلا اصول یہ ہے کہ وہ Child Centered ہو۔یعنی اس کا مرکز و محور طالب علم ہونا چاہیے۔ اسے بچے کی موجودہ ضروریات' دلچسپیاں اور قابلیت کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ اگرچہ اسے صرف موجود ضرورتوں تک محدود نہیں رکھنا چاہیے' اور دوسرے وہ بچے کو سیکھنے اور پڑھنے کے عمل میں شریک کرے۔علم کے حصول میں عملاً شریک ہونے کے طریقے سے زیادہ حسوں (Senses) کا استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے پاکستانی نظام تعلیم میں عملی کام کی بجائے صرف تھیوری پر زور دیا جاتا ہے۔لہٰذا صرف ایک ہی حس یادداشت (Memory) کام کرتی ہے' ایک طالب علم کے اندر مواد کو یاد کرنے کی جتنی زیادہ صلاحیت ہوگی اتنے ہی وہ زیادہ نمبر حاصل کر لیتا ہے اور اساتذہ بھی اسی کو سراہتے ہیں۔''دیکھا یہ کتنا اچھا حرف بہ حرف یاد کرتا/کرتی ہے''۔لہٰذا پڑھانے کے عمل میں

عملی کام اور علم کا عملی اطلاق بھرپور طریقے سے شامل ہونا چاہیے۔ مضمون کو طالب علم کی عمر اور ذہنی سطح تک لا کر پڑھانا چاہیے اور وہ مثالیں استعمال ہونی چاہیے جو اس کے حالیہ مشاہدے اور تجربے کے دائرے میں آتی ہوں۔ مزید برآں گروپ اور باہمی تعاون پر مبنی طریقہ تعلیم کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے' طالب علموں کے گروپ بنا کر انھیں پراجیکٹ دیئے جائیں' جس میں وہ مل کر دیئے گئے مسئلہ کو حل کریں' مذکورہ طریقے سے طلباء کو مسائل کے حل کرنے میں آزادانہ طور پر خود سے پیش قدمی کرنے اور اپنی قدرتی ذہانت دکھانے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ لہٰذا تعلیمی ادارے ایک ایسی گراؤنڈ بن جائیں گے جس میں سماجی ترقی اور باہمی تعاون پر مبنی زندگی کا تصور ابھرے گا اور ایک منظّم سماجی ذہانت بھی پیدا ہوگی۔

ہمارے آج کے اسکول ہی ہمیں خودغرض بنا دیتے ہیں' سب کی اپنی کامیابیاں ہوتی ہیں اور اپنی اپنی ناکامیاں.....ایک طالب علم کا دوسرے کی کامیابی و ناکامی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' تو پھر اس قوم کے تعلیم یافتہ افراد بھی اسی طرح بنتے ہیں ہمارے معروف ادیب اشفاق احمد نے اگر کہا کہ ''اس قوم کو جتنا تعلیم یافتہ طبقے نے نقصان پہنچایا ہے ان پڑھ نے نہیں.....'' تو ہم کیوں چونک پڑتے ہیں' جان ڈیوی کہتا ہے' ایسی قومیں اپنی بیماریوں کی جبلت دور کیے بغیر اخلاقیات کے مصنوعی خول سے انھیں دور کرنا چاہتی ہیں۔ ہم نے بھی اپنے اوپر ''پاک'' قوم کا جعلی بھرم طاری کر رکھا ہے۔ ہمیں بھی ڈبے سے باہر نکل کر خود کو اور دنیا کو دیکھنا چاہیے۔' روایتی فلسفہ تعلیم استاد کو ایک مقتدر شخصیت کے طور پر پیش کرتا ہے' جو مجسمہ دانائی اور محافظ علم ہے..... جب کہ جان ڈیوی کا تصور ٹیچر خوفناک اور آمرانہ شخصیت نہیں..... بلکہ ''اس وجہ سے کہ استاد ماہرانہ تربیت اور برتر ثقافتی تجربات کا حامل ہے' اس کا بنیادی رول یہ ہے کہ وہ بچے کے سیکھنے کی سرگرمیوں میں راہنمائی کرے'' اسے بچے کے نفسیاتی ارتقاء کے مرحلوں سے اچھی طرح واقفیت ہو۔ استاد کو بچے کے لیے منبع تدبیر ہونا چاہیے۔ بچہ جن انفرادی ضرورتوں اور دلچسپیوں کے مسائل کو خود حل نہ کر سکتا ہو' وہ ان کے لیے ٹیچر سے رجوع کرے۔ استاد کا کام ہے کہ وہ اجتماعی پڑھائی

(Group Learning) کو منظم کرے اور طلبا کے درمیان باہمی ربط (Interaction) پیدا کرے، تاکہ گروپ یا کلاس کا کوئی رکن صرف تماشائی نہ بنا رہے۔ وہ پڑھائی کی سرگرمی میں مکمل شریک ہو اور اپنے تجربے کو اپنے ساتھی طلبا کے ساتھ بانٹ (Share) رہا ہو، تاکہ ہر طالب علم پڑھائی کے عمل سے بہترین طور پر مستفید ہو سکے۔ استاد کا کام ہے کہ وہ طلبا کی ذہانت کو ترقی دینے کے لیے اسباب پیدا کرے تاکہ ان کے اندر مسائل کو حل کرنے کی صلاحیتیں بیدار ہو سکیں۔ جان ڈیوی کی ان ہدایات کی روشنی میں ہم اپنے سکولوں کے نظام تدریس اور اساتذہ کے رویے کا جائزہ لیں تو اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا کہ ہمارے ہاں ذہانت بڑھانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنے دقیانوسی خیالات کو بچوں پر ٹھونس کر نوخیز ذہانتوں کو جامد کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے استاد بچوں کو اپنی ذات اور زندگی کے بارے میں کوئی آزادنہ رائے قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتے، وہ پسماندہ اور فیوڈل معاشرے کی جہالت پر مبنی بنداقدار و نظریات کو بچوں پر مسلط کرتے ہیں۔ چنانچہ تبدیلی اور ترقی کے عمل کو روکتے ہیں۔' ذاتی مشاہدے کے مطابق ساتویں جماعت کی بچیوں کو ان کی استانی ہر وقت یہ لیکچر دیتی ہے، کہ لڑکیوں کے لیے ہنسنا بڑا برا فعل ہے وہ اپنی شلوار قمیض پر مبنی یونیفارم کے نیچے جسمانی سائز کے زیر جامہ پہن کر آئیں، سروں کے اوپر رومال اور دوپٹے لیں.....ادھر مرد اساتذہ بھی نوجوان لڑکوں کو مریضانہ اخلاقیات کے اسباق سے انھیں مستقبل کے منافق اور دوہرے کردار کی حامل شخصیتوں کے کردار میں ڈھال رہے ہوتے ہیں، ان کے ذہنوں میں ابہام اور جہالت بھر رہے ہوتے ہیں۔ زیر تدریس مضمون پر کسی بحث مباحثے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔ سوال کرنے کی اجازت اس لیے بھی نہیں ہوتی کہ استاد کسی ذہین طالب علم کے ایسے سوال سے خوف زدہ ہوتا ہے جس کا وہ شاید تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ اور جہاں تک جان ڈیوی کی اس بات کا تعلق ہے۔ کہ استاد یقینی بنائے کہ کوئی طالب علم کلاس میں محض تماشائی نہ بنا رہے تو ہمارے اسکولوں، کالجوں کا ذکر کیا، پاکستان کی قدیم ترین یونیورسٹی کے ایک نہایت شہرت کے حامل ڈیپارٹمنٹ میں دوسالہ زیر تعلیم

کے دوران اپنے ذاتی تجربے سے کہا جا سکتا ہے کہ کلاس میں 50 فی صد غیر حاضر دماغ اور باقی 48 فی صد تماشائی طلبا کی موجودگی پر حرام ہے کسی لیکچرار یا پروفیسر صاحبان نے کبھی نوٹس لیا ہو اور اپنے طریقہ تدریس کو بدلنے کی کوشش کی ہو اور جب کلاس روم کے اس ماحول کے نتیجے میں دس فی صد پاس کا رزلٹ نکلتا ہے تو ریاست اور معاشرے کی بے حسی بھی دیدنی ہوتی ہے' مجال ہے کسی کے چہرے پر پریشانی کی رمق نظر آئے۔

جان ڈیوی نظام تعلیم کی اصلاح کے لیے تجویز پیش کرتا ہے' کہ تعلیم کے عمل میں مضمون پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے طالب علم کو اپنا محور نظر بنانا چاہیے اور استاد کی غالب حیثیت کا خاتمہ ہونا چاہیے' جان ڈیوی کے انھی تباہ کن حملوں کے بعد امریکہ میں ایک تحریک Progressive Movement in Education کے نام سے چلی لیکن اس نے خود ایک انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لی' لیکن ہمارے لیے جو غور طلب بات ہے' جان ڈیوی نے نظام تعلیم میں بچے کے لیے مسرت' آزادی اور پہل کاری (Deligh, Freedom, Initiative) جیسے عناصر کے ہونے کو لازمی قرار دیا تھا.....ان کی ہمارے مروجہ نظام تعلیم میں کوئی جگہ نہیں۔

❖.....❖.....❖

دانش کا بحران

سیاسی، سماجی، معاشی اور اخلاقی بحرانوں سے ہم خوب واقف ہیں۔ کیا دانش کے فقدان کے بغیر یہ بحران صدیوں پر بھاری اور نسلوں تک پھیل سکتے تھے؟ آخر کیا اسباب ہوئے جس سے ہماری ذہانت کو زنگ لگ گیا اور دانش مٹی میں مل گئی۔

دانش کا لفظ ہمارے ماحول میں خاصا بدنام ہے اور اس پر پھبتیاں کسنا علمی بڑائی سمجھی جاتی ہے۔ دانائی کا یہاں صرف ٹھٹھا سنا ہے، اسے سنجیدہ موضوع بنتے نہیں دیکھا۔ کیا یہ دنیا ترقی یافتہ اور پس ماندہ اقوام میں منقسم ہے یا علم، عقل اور دانائی نے شمال اور جنوب کے درمیان حد فاصل قائم کر رکھی ہے۔ ہم جب بھی اپنے بحرانوں کے علل و اسباب ڈھونڈنے نکلتے ہیں، تو پھر امریکا، یورپ، جنرل، جج، جاگیردار سبھی کے نام گنوا ڈالتے ہیں، لیکن اپنی دانش کا محاسبہ نہیں کرتے.....کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اہل مغرب اپنی تاریخ کو بھی دانشورانہ ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ Enlightenment, Reformation, Renaissance وغیرہ اور پھر انھی فکری تحریکوں کی کوکھ سے وہاں صنعتی انقلاب جنم لیتا ہے۔ لیکن ہمیں اپنی تاریخ کو یوں تقسیم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ ہم نے صدیوں سے اس ابتدائی انسان کا معیار قائم رکھا ہے جو اپنے سوالوں کے جواب پانے کے لیے آسمان کی طرف دیکھا کرتا تھا۔

علم بشریات کے مطابق دانشوری کی تاریخ بہت دور تک جاتی ہے۔ مذہبی پروہتوں، روحانی معالجوں اور صوفیاء کی شکل میں دانشور اپنے معاشرے کی رہنمائی کا بیڑا اٹھاتے۔ قدیم

معاشروں میں ان کی اخلاقی ونظریاتی جدت پسندی (Innovation) دیوتاؤں کی خارجی اتھارٹی اور ورثے میں روایت کی پابند ہوا کرتی تھی' لیکن اٹھارویں صدی میں ان دانشوروں نے جرات مندانہ اعتماد کے ساتھ خود کو سوسائٹی کے سامنے پیش کیا۔اب ان کا یہ کہنا تھا کہ وہ اپنی دانائی سے سماجی بیماریوں کی تشخیص اور ان کا علاج کسی آسمانی مدد کے بغیر تجویز کر سکتے ہیں اور ایسی تھیوریاں بنا سکتے ہیں جن سے سماج کی پوری ساخت اور انسانوں کی بنیادی عادات میں بہتر تبدیلیاں پیدا ہو جائیں۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے پیش رووں کی طرح دیوتاؤں کے مفسر بننے کی بجائے ان کے متبادل کی حیثیت سے سامنے آئے۔انھوں نے اپنا آئیڈیل Prometheus کو بنایا جو دانش کی سماوی آگ کو چرا کر زمین پر لے آتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ساری فکری' نظریاتی' مذہبی اور تہذیبی وراثت کا عقل کی بنیاد پر سخت ناقدانہ تجزیہ کیا۔اس طرح جدید دنیا کے رویوں اور اداروں کی تشکیل میں دانشوروں کا کردار پچھلی دو تین صدیوں میں نہایت اہمیت اختیار کر گیا۔

کہتے ہیں وقت تخلیق خدا نے کائنات کی ساری صداقت دائیں ہاتھ میں اور اس کی ابدی جستجو کو بائیں ہاتھ میں لے کر اقوام عالم سے پوچھا چنو! کیا چاہتے ہو۔مغربی اقوام نے خدا کے بائیں ہاتھ کو چھو دیا اور کہا''اے خالق کائنات ہمیں صداقت کی ابدی تلاش دے دو کہ مطلق صداقت تمہاری ذات کا منصب ہے''۔لیکن ہمارے آباؤ جداد بنی بنائی' ریڈی میڈ صداقت کو پانے کے لیے خدا کے دائیں ہاتھ کی طرف جھپٹے۔اگر ہمارا تاریخی عمل میں کوئی رول نظر نہیں آتا یا علم کو پیدا کرنے یا اسے ترقی دینے میں ہم کوئی کردار ادا نہیں کر رہے تو اس کی ہمیں ضرورت بھی نہیں ہے۔کائنات کی ساری سچائیاں اور صداقتیں ہمارے گھر کے طاق پر رکھی ہیں.....علم و صداقت پر بلاشرکت غیرے اجارہ داری کا احساس نہ صرف ہمارے ہر لکھے پڑھے میں پایا جاتا ہے بلکہ حد یہ ہے کہ ان معاشروں کے ناخواندہ سے ناخواندہ فرد سے بات کر کے دیکھ لیں.....وہ ملکی سیاست سے لے کر بین الاقوامی معاملات تک' سماجی مسائل سے لے کر میٹا فزیکل گتھیوں تک.....ایک اٹل اور ناقابل ترمیم موقف لیے بیٹھا ہوگا.....اسے اپنے موقف کی صداقت پر اتنا

اندھا یقین ہوتا ہے کہ ذرا سے اختلاف رائے پر' کفر اور غداری وطن کے فتوے کے علاوہ سر پھٹول بھی ہوسکتی ہے.....اب وہ جو تھوڑا بہت پڑھے لکھے ہیں اور کسی طور علم و ادب کا حوالہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کی اناؤں کا Oversize باہر کو پھٹا پڑتا ہے' ایک جاہل' نیم خواندہ اور کم تعلیم یافتہ معاشرے میں ''صاحب علم'' ہونے کا گماں گردن میں وہ تناؤ پیدا کرتا ہے۔ کہ بڑے سے بڑا بقراط بھی دم نہ مار سکے۔ خواہ ان خواتین و حضرات کے علم کی سطح اور ذہانت کی حدود کچھ بھی ہوں۔ آج علم کے انتہائی ترقی یافتہ دور میں جہاں یورپ میں ہر سال اتنی کتابیں شائع ہوجاتی ہیں کہ ہم ترقی پذیر ملک اتنی اینٹیں بھی نہیں بناتے' ہمارے ہاں تکبر علم کا یہ حال ہے لیکن ادھر مغرب کی تربیت دیکھیے۔ دو ہزار سال قبل سقراط یہ کہتا نظر آتا ہے۔

"I am the wisest man alone, for I know one thing, and that is that I know nothing"

''میں عقل مند ترین زندہ انسان ہوں کہ مجھے اس بات کا پتہ چل گیا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا۔''

یہ صرف ہم پس ماندہ قوموں کا کمال ہے۔ ذرے کا علم نہیں آسمانوں کا حال احوال' چٹکی میں سنا دیں گے۔ ہمارا سارا علم اور اس کا منبع زبانی جمع خرچ پر موقوف ہے جس میں کسی تحقیق اور عملی کام کی کوئی ضرورت نہیں' چونکہ ہم عقیدہ پرست سائیکی کے مالک ہیں اس لیے بغیر جستجو اور ثبوت کے یقین کر لینا اور پھر اس پر ڈٹ جانا ہماری ریت ہے۔ ظاہر ہے ہم اسے کچھ بھی نام دے دیں' وہ علم نہیں ہوسکتا۔ علم انسان میں اعتماد اور طاقت بخشتا ہے۔ سارے جہاں کی صداقتیں ہمارے پاس ہونے کے باوجود ہم ذلت آمیز کمزوری سے کیوں دو چار ہیں؟ ظاہر ہے ہم کسی بہت بڑی فریب نظری میں مبتلا ہیں۔

جہاں تک ہمارے سرکردہ قومی و ملی دانشوروں کا تعلق ہے ان کی تاریخی ناکامی صرف اس حقیقت سے عیاں ہوتی ہے کہ ان کے فکری اثرات اس طرح اپنی قوم کے عادات اور اداروں کو نہ بدل سکے جس طرح مغربی دانشوروں نے اپنی اپنی قوموں کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ ہم اگر

ہزار سال تک بھی دور چلے جائیں۔ایک تو ہمارے دانشوروں کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں میں گنی جاسکتی ہے اور دوسرے وہ ہماری نفسیات اور عادات میں کوئی تبدیلی واقع نہ کر سکے۔ وہ صرف فریموں میں سجا کر رکھنے والی شخصیات ہیں۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے قومی دانش ور کوئی فکری انقلاب برپا کرنے میں کیوں ناکام ہوئے۔اگر ان کی سوچ سائنسی ہوتی تو اس کے نتائج بھی ضرور نکلتے۔وہ روایت کی قیود میں بند ہونے کے علاوہ اپنے سماج سے خوفزدہ رہے لہٰذا اصلاح فکر کی سب کوششیں دائرے کے اندر رہ کر ہی جاتی رہیں۔کسی نے روایتی فکری نظام کو مکمل طور پر چیلنج نہیں کیا.....ادھر مغربی دانشوروں کی تنقید کے سامنے کوئی حدود و قیود نہیں آئیں.....انھوں نے اپنے لوگوں کے سامنے بلیک اینڈ وہائٹ کا واضح فرق کر کے دکھا دیا۔جب کہ ہمارے ہاں بات گول مول ہو کر رہ گئی۔دانشوری کا طے شدہ فارمولا یہ رہا کہ قدیم بھی صحیح ہے اور جدید بھی ٹھیک ہے..... چنانچہ ہمارے دانشور کے افکار و اشعار کو ایک جدید' لبرل اور سیکولر ذہن کا حامل بھی اس طرح استعمال کرتا ہے جس طرح مسجد کا مولوی.....تبدیلی کہاں سے آتی؟ گدھا کنوئیں کے اندر ہی رہا اور یہ سلسلہ ہماری دانش کی ہر سطح پر چل رہا ہے۔باتیں اور بحثیں بے حد و حساب ہوتی ہیں' رہتے وہی کے وہیں ہیں جہاں تھے.....نہ کوئی بادشاہ کو ننگا کہتا ہے نہ بات بنتی ہے۔جہاں تک عام آدمی کا تعلق ہے اس نے صدیوں کی جہالت کا وزن اپنے سر پر اٹھا رکھا ہے۔نسل در نسل علمی ترقی نہ ہونے کی وجہ سے ہماری معیشتیں اس قدر پتلی ہو چکی ہیں کہ نہ عام آدمی کا معیار زندگی بہتر ہوتا ہے نہ وہ ترقی کی طرف جانے والے خیالات کی طرف مائل' چنانچہ وہ پس ماندہ ثقافت ہی میں اپنی پہچان اور عزت محسوس کر رہا ہے۔

ایسی ہی پیچیدہ صورت حال میں جہاں پر پورا سچ نہ بولا جاسکے منافقانہ رویہ پیدا ہونا لازمی امر ہے۔چنانچہ ہمارے ہاں کے دانش ور پرائیویٹ محفلوں میں اپنے عمل اور خیالات میں کچھ اور ہوتے ہیں جب کہ پبلک امیج کچھ اور بنائے رکھتے ہیں۔ظاہر ہے ہر ایک کو اپنی جان' مال اور عزت پیاری ہوتی ہے' بلکہ ان میں اضافہ بھی درکار ہوتا ہے' جو قائم شدہ افکار اور رائج شدہ

اقدار حیات کی بڑھ چڑھ کر تحسین سے ہی ہوسکتا ہے۔ کہتے ہیں 'Knowledge is a responsiblity' یعنی علم آپ پر صداقت کے اظہار کی ذمہ داری عائد کر دیتا ہے۔ لیکن ہمارے دانشوروں کا حال یہ ہے کہ اگر ریاستی پابندیاں نہ بھی ہوں اور معاشرتی پابندیاں بھی وقت کے ہاتھوں اپنی موت آپ مر رہی ہوں تب بھی ان کے اندر کا اپنا خوف سنسر شپ بن کر تخلیق علم اور تہذیب فکر کے عمل کو آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ ان مسائل و اقدار کے حق میں واہ واہ کی صدائیں بلند کی جاتی رہتی ہیں جنھیں ریاست اور معاشرے کی قبولیت میسر ہو خواہ یہ معاشرے کی ترقی کی راہ میں کتنی بڑی رکاوٹیں کیوں نہ ہوں۔ اس طرح جامد معاشروں کے نام نہاد ذہین افراد وقت کا پہیہ الٹا چلانے میں برابر کے شریک ہیں بلکہ ان معاشروں کی ترقی اور تبدیلی کو روکنے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ یہ ظاہری طور پر ترقی اور تبدیلی کے دلدادہ نظر آئیں گے۔ روشن خیال اور علم پرور باتیں کیے بغیر دانشوری کی شناخت قائم نہیں رہ سکتی لیکن جب کبھی ترقی اور تبدیلی کی طرف حقیقی قدم اٹھانے کی بات کی جائے گی' تبدیلی کے خلاف ہزار بہانے سامنے لے کر آ جائیں گے'' عوام تیار نہیں ہیں''، ''مشین جب آئے گی تو عوام کی جہالت بھی خود ہی ختم ہو جائے گی''، وغیرہ گویا اس پر اسس میں کسی شعوری عمل اور فکری تحریک کی ضرورت نہیں' نہ خود مثال بنتے ہیں' نہ تبدیلی و ترقی کے لیے کوئی سخت موقف اختیار کرتے ہیں۔ جنھیں ہم جاہل عوام کہتے ہیں تبدیلی و ترقی کی سب سے زیادہ ضرورت انہی کو ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر یہ دانشور حضرات چالو اقدار اور رائج الوقت نظریات کے خلاف ذرا سا بھی ڈٹ کر موقف اختیار کریں تو عوام ان کا ساتھ دے سکتے ہیں اور معاشرے سے جہالت کا زنگ اتر سکتا ہے۔ لیکن اصل مسئلہ ان معاشروں کے ذہین افراد میں جرات کی کمی اور وقتی مفادات کے حصول میں مبتلا ہونا ہے' چنانچہ بنیاد پرست اور تحقیق و اصلاح کی مخالف قوتیں اقلیت اور تاریخی رخ کے مخالف کھڑے ہونے کے باوجود دندناتی پھرتی ہیں اور پورے معاشرے کو بلیک میل کیے رکھتی ہیں کہ خبردار کسی ثقافتی تبدیلی کی طرف کوئی قدم اٹھایا..... اس طرح ان جامد معاشروں کے پڑھے لکھے افراد جانے انجانے میں ''اپنی اقدار'' پر زور دینے

کے فیشن میں شریک ہو جاتے ہیں حالانکہ دانشوری کا مطلب تبدیلی و ترقی کی طرف بڑھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ اگر صرف چالو نظام کو ہی قائم رکھنا ہے اور اس میں کسی تغیر و تبدیلی کی ضرورت نہیں، تو پھر کسی دانش کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ کیا پوری انسانی تاریخ میں کہیں نظر آتا ہے کہ سماجی اقدار مستقل طور پر جامد و ساکت ہوگئی ہوں۔ یا تو معاشرے اپنی پیاری قدروں سمیت فنا ہوگئے یا پھر بدلتی اقدار کو اپنا کر فطرت وحیات کے نئے تقاضوں کے مطابق آگے بڑھتے رہے، چنانچہ ہم بڑی ہی دانشورانہ ترنگ میں آئیں گے تو تمام مسائل کا حل معاشرے کو زیادہ سے زیادہ کہنہ اقدار کی طرف لوٹ جانا تجویز کرتے ہیں۔ دلیل یہ کہ ہم نے پرانی اقدار چھوڑ دیں اس لیے بے راہ رو ہوگئے، جب کہ مسئلہ الٹا ہے۔ پرانی اقدار اب لوٹ کر واپس نہیں آسکتیں۔ معاشرے کی بے راہ روی اس لیے ہے کہ ہم نئے اقدار پیدا نہیں کر رہے یا ان سے خوف زدہ ہیں اور قبول نہیں کر رہے۔

نہ جانے ماہرین ذہانت کی کیا تعریف کرتے ہیں، لیکن اس کی ایک تعریف مشکل پسندی بھی کی جاسکتی ہے کیونکہ تمام ذہین افراد مشکل پسند ہوتے ہیں۔ وہ خود کو مشکل صورت حال میں ڈالتے اور انتہائی پیچیدہ گتھیوں میں خود کو الجھاتے ہیں اس لیے وہ افراد جو مشکل پسند ہوتے ہیں، وہ مثالی قرار پاتے ہیں۔ ہیرو اور دیوتا بن جاتے ہیں، تمام قائدین مذاہب، صوفیاء، فلاسفروں، سائنس دانوں اور انقلابیوں کی جو بات انھیں عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہے، وہ ان کی مشکل پسندی تھی۔ وہ اپنی مروجہ حالات پر مطمئن نہیں ہوئے بلکہ نئے افکار، نئی راہوں اور نئی صداقتوں کی جستجو میں چل پڑے۔ یہ کام ظاہر ہے بڑے جوکھم کا ہے۔ بنی بنائی جگہ اور روایتی رشتوں کو چھوڑ کر ان دیکھی منزلوں پر گامزن ہو جانا جن کی طرف بنے بنائے راستے نہیں جاتے۔ اب ظاہر ہے، ہمارے معاشرے کے ذہین و فطین طبقے یعنی (Middle Class Intelligensia) کو اپنی فطرت کے مطابق بے چین، اور اختراع پسند ہونا چاہیے، لیکن اس کے تو وہی نعرے ہیں اور وہی زیر بحث مسائل ہیں جو چالو نظام کے کسی بھی ستون کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے، چنانچہ ان حالات

میں اوسط درجے کی ذہانت اور تخلیقی صلاحیتوں کے حامل افراد یعنی Mediocrity کی خوب بن آتی ہے۔ اندھوں میں کانے کا خوب راج چلتا ہے۔ کسی Commitment سے عاری یہ ہوشیار لوگ اپنی دانش وری کو خوب کیش کرواتے ہیں۔

ہمیں ایک ایسے معاشرے کا سامنا ہے جو روشنی سے گریز کرتا ہے اور جسے اندھیرے زیادہ مرغوب ہیں۔ جہاں جہالت کو کھلی چھوٹ ہے اور علم پر ہزار پابندیاں ہیں' ترقی کا عمل مادی سطح پر کیسے شروع ہوسکتا ہے۔ جب تک فکری تبدیلیاں رونما نہ ہوں۔ اگر ہم اپنے قومی' سیاسی اور سماجی حالات پر مطمئن نہیں ہیں' تو پھر ہمیں اپنے افکار و اقدار پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ہمارے طے شدہ نظریات تو درست ہوں۔ لیکن ہم پھر بھی بھٹک رہے ہیں۔ آج کے سائنسی اور معاشیاتی دور میں بظاہر یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے کہ کسی قوم کو' علم اور ترقی سے بیر ہو۔ لیکن بدقسمتی سے ہم اس کی زندہ مثال ہیں اوروں کی غلامی پر آنسو بہانے والی قوم اپنی سرتاپا غلامی کو محسوس کرنے سے گریزاں ہے۔ عام شہری سے لے کر صاحبان اقتدار تک اور جاہل سے لے کر دانشور تک' اپنی سرزمین پر چار سو پھیلی بے حساب پس ماندگی اور جہالت۔ کسی کے اعصاب کو متاثر نہیں کرتی۔ کسی کا سر نہیں جھکتا۔ کوئی منہ نہیں چھپاتا۔ ہماری انا اور احساس تفاخر کے لیے جذباتی باتیں' کھوکھلے نعرے' قومی نغمے اور ستائش ذات ہی کافی ہے۔ ہم نے ترقی کی راہ میں خود ہی فکری و مادی بڑی بڑی رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہیں۔ وقت بڑی تیزی سے ہمیں پیچھے کی طرف پھینک رہا ہے۔ تہذیبی ترقی کے بڑے ہی اعلیٰ درجے پر پہنچے ہوئے دور کے سامنے ہم اپنی شناخت کے بحران کا شکار ہیں۔ ہمارا نہ کوئی مستقبل ہے' نہ کوئی منزل۔ ہمارا عقل پر سے اعتبار حیران کن حد تک کم ہو چکا ہے۔ عقل سے دور اور جذبات کے ساتھ از حد قربت نے ہماری فکری راہوں کو ایسے الجھا دیا ہے کہ بھٹکنے کے سوا ہماری کوئی منزل باقی نہیں رہ گئی۔ ہم ماضی سے لپٹے آج میں زندہ ہیں۔ وہ ماضی جو ہماری خواہشوں نے بن رکھا ہے' جو ہماری کمزوریوں پر پردہ ڈالتا ہے' ہماری اناؤں کو جھوٹی تسلیاں دیتا ہے ورنہ ماضی کے مزاروں میں یہی کہیں ہماری عقل' منطق

اور دانش کے مدفن بھی مل جاتے ہیں۔علوم عقلیہ اور بنیادی سائنس کی نرم و نازک کونپلیں اسی وقت جھلس گئی تھیں جب مراکش اور اسپین میں ابن رشد کی تحریروں کو آگ لگا دی گئی تھی۔آج اس کی کوئی اپنی تحریر عربی زبان میں موجود نہیں۔یہ کوڑے برسنے اور نعرہ تکبیر کی آوازیں کیسی؟ایک 60 سالہ بوڑھے کو پر ہجوم مجمعے کے سامنے کوڑے لگائے جا رہے ہیں۔جی ہاں یہ وہی عظیم فلاسفر الکندی ہے جو دربار مامون کا نہایت روشن ستارہ تھا۔اس توہین آمیز سلوک اور صدمے سے الکندی کی شخصیت ایسے پارہ پارہ ہوئی.....اور دانش کا یہ ستارہ ایسا بجھا کہ اس نے موت تک خاموشی اختیار کئے رکھی.....اسی الکندی نے ایک بار کہا تھا' ''صداقت دو مختلف سطحوں پر وجود رکھتی ہے۔ایک جاہل اور ناخواندہ عوام کی سچائی ہوتی ہے اور دوسری تعلیم یافتہ افراد کی.....'' یہی کہیں ازمنہ وسطی کے ایک اور نابعہ روزگار عظیم طبی سائنس دان رازی کی کتاب کو اس کے سر پر اس وقت تک مارا جاتا رہا جب تک وہ دماغی چوٹوں سے اندھا نہ ہو گیا.....جب اس کے ایک دوست ماہر بصریات نے اس کی نظر کا علاج کرنے کی پیش کش کی تو رازی کا جواب تھا' ''میں اس دنیا کو بہت دیکھ چکا ہوں اور مجھے مزید دیکھنے کی کوئی حسرت نہیں.....'' یہ وہی رازی تھا جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا۔

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومیؒ کبھی پیچ و تاب رازی

حد یہ ہے کہ ابن خلدون کو بھی انیسویں صدی میں مغرب نے متعارف کروایا.....چار سو سال تک مسلمان ابن خلدون کے وجود سے بے خبر رہے.....پتہ چلتا بھی کیسے.....امام حنبل کا فتویٰ ہی کافی تھا کہ کسی ایسی چیز پر بحث کرنا حرام ہے جس پر نبی نے بات نہ کی ہو.....علم منطق کو حرام قرار دینے کا خلیفائی فرمان ہمارے کانوں سے اترتا ہی نہیں ہے۔ابن ہیثم' ابن رشدؒ الفارابی اور ابن سینا پر امام غزالی کے لگائے ہوئے کفر کے فتوے ہمارے تحت الشعور کا الافانی جز بن چکے ہیں۔برٹرنڈ رسل کا کہنا ہے کہ اس پر یاسیت کے کئی بار ایسے دورے پڑے

کہ اس نے خودکشی کے بارے میں نہایت سنجیدگی سے غور کیا لیکن یہ علم ریاضیات سے اس کے محبت کا نتیجہ تھا' کہ اس کی زندگی بچ گئی۔

لیکن ہماری احتیاط کا عالم یہ ہے کہ بقول امام غزالی ''ریاضیات ممنوعہ مضمون (غیر اسلامی) تو نہیں لیکن اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ اس سے انسان کفر کی طرف چلا جائے۔ کیونکہ ریاضی کا طالب علم سوالوں کو مکمل صحت وضاحت (Clearity and Precision) کے ساتھ دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے' لہٰذا امکان ہے کہ اس کی چیزوں کو بہت واضح اور ٹھیک ٹھاک سمجھنے کی آرزو اسے ایمان کے خلاف کر دے.....'' پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فلاسفی کے ایک سابق سربراہ پروفیسر سی اے قادر اپنی کتاب ''اسلام اور فلسفہ'' میں لکھتے ہیں' ''غزالی کی تحریک سے نہ صرف مسلمان فلسفے کے خلاف ہو گئے بلکہ سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ انھوں نے Philosophise کرنا ہی چھوڑ دیا۔'' صدیوں سے ہم سوال اٹھانے' اس پر مبنی بر عقل غور کرنے کی عادت کو بھول چکے۔ ہمارا دانش ور آج تک اس دہشت میں زندہ ہے جس کے زیر اثر ہزار سال قبل ایک اندھا سکالر حسن ابن محمد یہ کہنے پر مجبور ہوا'' خدا سچا ہے' ابن سینا جھوٹا ہے''

کیا ایسے پس منظر میں ہمارے خطے کو ایک نیٹشے کی ضرورت نہیں جو ایسے پاگل آدمی کا کریکٹر تخلیق کرے جو کسی روشن صبح کے وقت لالٹین جلائے لوگوں سے بھرے بازار میں چلاتا پھرے'' مجھے عقل کی تلاش ہے' مجھے دانش کی تلاش ہے۔'' ظاہر ہے جو عقل پر ایمان نہیں رکھتے ان کے لیے یہ منظر باعث تمسخر ہوگا۔ ایک نے کہا'' ارے بھئی کیوں عقل گم ہوگئی؟ کیا وہ کسی بچے کی طرح راہ بھول گئی ہے؟ دوسرے نے کہا کیا عقل نے خود کو چھپا لیا ہے؟ کیا وہ ہم سے خوفزدہ ہے؟ کیا وہ بحری سفر پر نہیں نکل گئی.....؟ کیا وہ ہجرت کر گئی ہے؟ لوگ قہقہے مار کر ہنس رہے تھے اور آوازے کس رہے تھے۔ پاگل آدمی اچھل کر ان کے بیچ آ کھڑا ہوتا ہے۔ لوگوں کی آنکھوں میں اپنی نظریں گاڑ کر کہتا ہے۔'' دانش کہاں چلی گئی'' وہ چلایا' میرے کہنے کا مطلب ہے ہم نے اسے مار دیا ہے تم نے اور میں نے۔ ہم سب اس کے قاتل ہیں! لیکن یہ کیسے ہوا؟ ہم

یہ سمندر پی جانے کے قابل کیسے ہوئے؟ ہمیں کس نے اسفنج دیا تھا کہ ہم نے سارے افق کو پونچھ ڈالا؟ زمین کو سورج سے چھڑا کر ہم نے کیا کیا؟ کیا اب یہ حرکت کر سکے گی؟ کیا اب ہم ہمیشہ کے لیے ٹکراتے نہ پھریں گے؟ آگے پیچھے، ادھر ادھر سب اطرف میں؟ کیا اب کوئی اوپر اور نیچے باقی رہ گیا ہے؟ کیا ہم لامحدود نیستی میں کھو تو نہیں گئے؟ کیا ایک خالی مکان ہمارے اوپر نہیں رہ گیا؟ اور کیا وہ ٹھنڈا نہیں ہو گیا؟ کیا رات تاریک سے تاریک تر نہیں ہوتی جا رہی؟ کیا ہمیں صبح کے وقت بھی لالٹینیں نہیں جلانی پڑیں گی؟ کیا ہمیں گورکنوں کی آوازیں نہیں سنائی دے رہیں جو دانش کو دفن کر رہے ہیں؟ کیا ہم بدبو نہیں سونگھ رہے، عقل کے گلنے سڑنے کی.....!''

دانش مر گئی، دانش مری ہوئی ہے، ہم سے بڑا قاتل اور کوئی نہیں گزرا۔ جسے آج تک دنیا مقدس ترین اور طاقت ور ترین سمجھتی تھی وہی ہماری چھری کے نیچے خون سے لت پت پڑا ہے۔ خون کے یہ دھبے کتنی برساتوں کے بعد دھلیں گے؟ وہ پانی کہاں سے آئے گا جس سے ہم اپنا دامن صاف کر سکیں گے؟ اب ہم کون سا مقدس کھیل وضع کریں گے؟'' یہاں پر پاگل خاموش ہو جاتا ہے، اس کے سننے والے سب خاموش ہیں، وہ اسے حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ آخر کار وہ اپنی لالٹین کو زمین پر دے مارتا ہے۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور وہ بجھ جاتی ہے۔ ''میں جلدی آ گیا ہوں'' وہ کہتا ہے ''میرے لیے یہ وقت ابھی مناسب نہیں ہے'' یہ حیران کن واقعہ ابھی اپنی راہ پر ہے اور سفر کر رہا ہے۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج کو وقت درکار ہے۔ اگر وہ واقع ہو بھی چکے ہیں تب بھی انھیں دیکھنے اور سننے کے لیے وقت چاہیے.....'' کہتے ہیں اس روز وہ پاگل کئی دانش کدوں، اور علم و ادب کے مراکز میں پھرا اور اپنا ماتمی گیت گاتا رہا اور جب اس سے استفسار کیا جاتا اور پاگل جان کر باہر دھکیل دیا جاتا تو وہ ہر بار یہی کہتا ''یہ عمارتیں دانش کے مزاروں اور علم کے عجائب گھروں کے سوا اور کیا ہیں؟''

❖.....❖.....❖